شعلے
از
احمد علی
ناشران
کتاب خانہ
عابد بلڈنگ حیدرآباد
مکتبۂ اردو لاہور
بار دوم
تعداد ایک ہزار
قیمت عہ

پہلی بار ——— اپریل ۱۹۳۶ء

دوسری بار ——— نومبر ۱۹۳۸ء

برانچ کوآپریٹیو کیپٹل پرنٹنگ پریس وطن بلڈنگ لاہور میں باہتمام شیخ ظہور الدین
صاحب طبع ہوئی اور چوہدری نذیر احمد مالک
مکتبہ اُردو نے شائع کی

فہرست مضامین

تصویر کے ۲ رُخ

تیسرے پہر کے وقت بیگم ابنّ انگنائی میں پلنگ پر بیٹھی چھالیا کتر رہی تھیں۔ سامنے باورچی خانہ میں ماما ہنڈیا بگھار رہی تھی جب ڈیوڑھی میں کسی نے کنڈی کھٹکھٹائی۔ تو بیگم ابنّ بولیں۔

"اری دلچسپن دیکھیو تو کون کھٹکھٹا رہا ہے؟ اس شور سے تو ناک میں دم آگیا" اتنے میں باہر سے آواز آئی۔

"میں آجاؤں؟"

"کون ہے؟"

"میں ہوں۔ بشیر"

"میاں بشیر! آؤ میاں۔ بہت دنوں میں آئے ہو۔ کیا راستہ بھول گئے؟"

"آداب عرض ہے"

"عمر دراز۔ تم تو عید کا چاند ہو گئے۔ کبھی آتے ہی نہیں"

"ممانی جان ان دنوں کام بہت رہا۔ روز آنے کا ارادہ کرتا تھا۔ لیکن کچھ نہ کچھ ایسا کام نکل آتا کہ آنہ سکتا۔"

"اچھا کہو، چھماں بیگم تو اچھی ہیں؟"

"جی ہاں۔ وہ بھی آنیکا ارادہ کر رہی ہیں۔ کسی دن آئینگی۔"

"لو میاں پان لو۔ تم تو شاید زردہ نہیں کھاتے؟"

"جی نہیں۔ آداب عرض۔"

"عمر دراز"

"کیا ماموں جان کہیں گئے ہیں؟"

"تمہارے ماموں جان کہاں جائینگے؟ موئے کبوتر بھی تو چھپا چھوڑیں۔ دن بھر وہ جوتیاں پیٹی ہیں۔ کہیں تو چھت کی اللہ آمین منا رہی تھی۔ وہ شور تھا۔ کہ خاک پیٹے شہدے بھی کیا کریں گے۔ آج کھانا کھانے بھی نہیں اترے۔ مجھ کمبخت ماری کو دو گھنٹے بھوکا رکھا جب بہت بکی بولی تو اتر کر آئے۔ لیکن بس منہ جھٹال کر پھر وہی ٹھنٹھ کے الو کی طرح کوٹھے پر۔"

"ممانی جان بیچارے کیا کریں۔ بیکاری میں کوئی نہ کوئی شوق ہونا چاہیئے"

"آگ لگے ایسے شوق کو۔ شوق نہ ہوا۔ دیوانہ پن ہو گیا۔ جب دیکھو کبوتروں ہی کی باتیں ہوتی ہیں۔ نہ آٹا چھوڑیں نہ گھی۔ کبوتر کیا ہوئے

آدمیوں سے بڑھ گئے۔ ابھی ابھی گاؤں سے گھی کا پیپا آیا تھا۔ مشکل سے ایک ہفتہ ہوا ہو گا۔ کہ بس صفاچٹ۔ پہلوانوں کو بھی کوئی اتنا گھی نہ دیتا ہو گا۔ نہ معلوم اُن کو پلاتے ہیں۔ یا یار دوستوں کو بانٹ دیتے ہیں۔ اور ملنے جلنے والے بھی سب جھلسے کبوتر باز۔ دن بھر کنڈی پٹا کرتی ہے۔ شوق نہ ہوا۔ آفت آ گئی۔ اور اُدھر اللہ میاں نے اولاد بھی دی تو ایسی۔ دن بھر وہ دھما دھم ہوتی ہے۔ کہ کچھ ٹھکانا نہیں۔ ان موئے فرنگیوں نے بھی کیا کیا کھیل نکالے ہیں۔ یہ موئی فٹ بال بھی کیا نکلی ہے۔ کہ نتھنوں میں تیر دبیئے ہیں۔ گیند ہے کہ ہر دم کمرے ہی میں گھسی چلی آتی ہے۔ میاں میں تو دہل دہل کے رہتی ہوں۔ کوئی گھڑی بھی کمبخت چین کی نصیب نہیں ہوتی۔ اور اُدھر میاں حمید کی وجہ سے دن کا کھانا اور رات کی نیند حرام ہو گئی ہے۔ جب تک ولایت میں رہے۔ تو بھی اللہ آمین کیا کی کہ کہیں کوئی موئی میم ویم نہ کر لائیں یارب وہاں سے تو خیریت سے چلے آئے۔ لیکن اب یہ اچھا شگوفہ چھوڑا ہے"!

"جی نہیں ممانی جان۔ دراصل آپ لوگوں میں ملکیت کا احساس بہت زیادہ ہے۔ جو سچ پوچھئے۔ تو آپ لوگ اولاد کو بھی اپنی ملک ہی تصور کرتے ہیں۔ یعنی اولاد بھی تو انسان ہوتی ہے۔ جسطرح آپ

لوگ کوئی بات کرنی چاہتے ہیں۔ اُسی طرح اولاد بھی آزادی سے ایک بات کو کرنا چاہتی ہے۔ لیکن آپ لوگوں کو یہ بات آخر کیوں ناگوار گذرتی ہے۔ اور حمید کو تو آپ لوگ سمجھتے ہی نہیں۔ اُس کا سا بیٹا ہونا تو بہت مشکل ہے۔ حمید کو"۔۔۔۔

"اُس بے ایمان حمید کا کس نے نام لیا!" میر ابّن نے زینے ہی میں سے چلّا کر کہا۔

"ماموں جان آداب عرض"

"اچھا، یہ جناب ہیں۔ اُس بدبخت کے نام لیوا!"

"آپ حمید سے بیکار اس قدر ناراض ہیں"

"ناراض! میں تو اُس نالائق کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔ میری ناک کاٹنے میں اُس نے کیا کسر چھوڑی ہے۔ کمبخت مسلمان کے گھر میں پیدا ہو کر یہ باتیں کرتا ہے۔ ہندنی سے شادی کریگا! میرا دل تو بھن بھن کے رہتا ہے۔ بجائے اس کے کہ بڑھاپے میں ماں باپ کی خدمت کرے، اپنی قابلیت اور سعادتمندی سے ان کا نام روشن کرے، اب یہ کلنک کا ٹیکہ لگائیگا۔ اس سے تو اگر مر جاتا۔ تو بہتر ہوتا!"

"ماموں جان وہ جو کچھ کہتا ہے۔ وہ بھی تو سنئے!"

"بس اب کہہ لیا تو کہہ لیا۔ آئندہ میں اُس نالائق کا نام تک سُننے کا

روادار نہیں۔ کیا میری ہی اولاد ہے؟ خدا کمبخت کو موت دے! . . .

میر صاحب غصے سے کھولتے ہوئے باہر چلے گئے۔ گرمیوں کی شام تھی۔ ابھی تک گلی کوچوں سے گرمی کے بھپکے نکل رہے تھے۔ سڑک پر لوگ اپنی اپنی دوکانوں کے سامنے چھڑکاؤ کر رہے تھے۔ سودے والے طرح طرح کی آوازیں لگا رہے تھے۔ اور اس کے باوجود فضا میں ایک قسم کی بھیانک افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ میر صاحب اپنے خیالات میں محو چلتے گئے۔ جب وہ ٹیا محل پہنچے۔ تو بھیڑ میں سے گھستے چلتے دو آدمی ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے اُن کی طرف آئے۔ اگلا تو صفائی سے بچکر میر صاحب کے برابر نکل گیا۔ لیکن جب دوسرا آیا۔ تو میر صاحب ایک کھڑے ہوئے تانگے کے برابر سے گزر رہے تھے۔ آدمی نے راستہ کم کرنے کے لئے میر صاحب کے برابر سے جھپکی لینی چاہی۔ لیکن شامت اعمال کہ بچنے کے بجائے وہ میر صاحب سے ٹکرا گیا اور اُنکی طرف بہت کھسیانا اور خفیف ہو کر دیکھنے لگا۔ میر صاحب کی چڑھی ہوئی اُدھی اُنکی چوگوشہ ٹوپی اور قوی ہیکل ہیئت دیکھ کر گھبرایا۔ مگر اتنے ہی میں میر صاحب بہت طیش کھا کر بولے:۔

"حرامزادہ کہیں کا! دیکھتا نہیں کون جا رہا ہے!"

میر صاحب کے حلیہ سے تو وہ ذرا سہم گیا تھا، لیکن یہ الفاظ

سُنکر بولا:۔

"بس میاں، بس۔ بہت سے تمہاری طریوں کے دیکھ لئے ہیں۔ وہ زمانے لد گئے۔ ملیے بنو، ملیے"

یہ کہکر وہ بھاگتا ہوا اپنے ساتھی کو پکڑنے چل دیا۔

برابر سے ایک آدھ قہقہوں کی آواز آئی۔ پھر کیا تھا۔ ایک تو کریلا اور اوپر سے نیم چڑھا۔ میر صاحب کے جذبۂ خودنمائی کو وہ ٹھیس لگی۔ کہ ان کا منہ لال انگارا ہو گیا۔ ان کی ساری رعونت، ان کا سارا وقار خاک میں مل گیا۔ آگ بگولا ہو کر میر صاحب ہنسنے والوں کو دیکھنے کے لئے مُڑے ایک پان والے کی دوکان پر کچھ لوگ کھڑے میر صاحب کی طرف مُنہ کئے ہنس رہے تھے۔ میر صاحب اُن کی طرف سڑک کے اُس پار لپکے لوگوں نے اپنے مُنہ موڑ لئے۔ اور پان والے کی طرف مخاطب ہو گئے۔ پھر کچھ میر صاحب کو خیال آیا۔ کہ فضول کا جھگڑا مول لینا ہے۔ دوسرے اُسی وقت ان کی نگاہ نواب چھمّاں کی فٹن پر پڑی۔ جو اُن کی جانب پیچھے سے آ رہی تھی۔

نواب چھمّاں نے گھوڑے کو چابک چھُوایا۔ اور تیزی سے میر صاحب کے پاس پہنچکر گاڑی روک لی۔

"اوہو میرا بنّ۔ آؤ بھئی، میں تو دعا ہی مانگ رہا تھا۔ کہ تم سے

ملاقات ہو جائے۔ آؤ بیٹھ جاؤ۔"

میر صاحب فٹن میں سوار ہو کر سینہ نکال کے بیٹھ گئے، اور بہت اکڑ کر پیچھے مُڑے۔ اور پان والے کی دوکان کی طرف آنکھیں نکال کر دیکھا۔

"خیریت تو ہے بھئی!" نواب صاحب نے پوچھا۔ "یہ مکدّر کیسے ہو!"

"بھائی کیا پوچھتے ہو۔ ادبار۔ ادبار۔ لوگوں میں سے احساسِ شرافت جاتا رہا۔ نہ دلوں میں غیرت، اور نہ مرتبہ کی پہچان۔ نہ معلوم کس وقت کس کی عزت اُتار دیں۔ حد ہے۔ کہ اولاد تک میں فرمانبرداری کا مادّہ باقی نہیں رہا۔"

"بھئی کہتے تو سچ ہو۔ نہ بڑے کی تمیز رہی۔ اور نہ چھوٹوں کا خیال اور اوپر سے آزادی کی ایک اور ہوا چل نکلی ہے۔"

اسی طرح باتیں کرتے ہوئے میر صاحب اور نواب چھمّاں جامع مسجد سے ہوتے ہوئے چاوڑی بازار میں سے گذرے۔ وہ ابھی بڑھ شاہ بُولا تک بھی مشکل سے پہنچے تھے۔ کہ ایک شور غل کی آواز بلند ہونے لگی۔ جلدی جلدی دوکاندار اپنی اپنی دوکانیں بڑھا رہے تھے۔ دو دو ایک ایک کر کے لوگ حوض قاضی کی طرف چلنے لگے۔ یہاں تک کہ یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ ایک رَو ہے۔ جو بہتی چلی جا رہی ہے۔

"بھئی یہ کیا ماجرا ہے؟" نواب چھمّاں نے میر صاحب کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔

"میاں وہی کوئی بلوا ولوا ہو گیا ہوگا۔ ترکِ موالات کی بھی تو عجیب وبا پھیل گئی ہے۔"

نواب صاحب اپنی گاڑی بڑھائے چلے گئے۔ تھوڑی ہی دُور چلنے کے بعد قاضی حوض کی طرف سے شور کی آواز شروع ہو گئی۔

"یہ کیا چیخ رہے ہیں؟" نواب صاحب نے پھر پوچھا۔

دونوں نے کان لگا کر سُنا۔ دور سے آواز آرہی تھی۔

"ٹوڈی بچہ ہائے ہائے! ٹوڈی بچہ ہائے ہائے۔"

میر صاحب نے ایک قہقہہ لگایا۔

"یہ بھی کمبختوں نے کیا جملہ نکالا ہے۔ کوئی تُک بھی ہے؟"

"ٹوڈی بچّہ ہائے ہائے!"

جب گاڑی ذرا اور نزدیک پہنچی۔ تو اُنھوں نے دیکھا کہ پولیس کا ایک جتھا اُن کی طرف پیٹھ کئے کھڑا ہے، اور لوگ سپاہیوں کے سامنے ایک ہجوم کئے جھنڈے ہاتھوں میں لئے کھڑے ہیں۔ چاوڑی کی سمت میں بھی لوگ جمع ہو رہے تھے۔ اب نواب صاحب نے اپنی گاڑی روک لی۔

شور کی آواز دب گئی ۔ یہ معلوم ہوتا تھا ۔ جیسے لوگ پولیس سے کچھ مکالمہ کر رہے ہیں ۔ یکایک ایک اور نعرہ بلند ہوا ۔

"بول مہاتما گاندھی کی جے !"

اور اس کے بعد ہی جھنڈے ہوا میں ناچنے لگے، اور لوگ زور زور سے چلائے :۔

"انقلاب زندہ باد! انقلاب زندہ باد!"

نواب صاحب فراشخانہ میں رہتے تھے ۔ اُنہوں نے دیکھا ۔ کہ گاڑی کا اس جگہ سے لیجانا ناممکن ہے ۔ اور اسی میں خیریت جانی کہ واپس لوٹ کر نئی سڑک سے چاندنی چوک ہوتے ہوئے گھر پہنچ جائیں ۔ جب نواب صاحب گھنٹہ گھر پہنچے ۔ تو وہاں بھی اُنہوں نے یہی ماجرا دیکھا ۔ اور یہاں پولیس کے علاوہ گوروں کی ایک پلٹن بھی دکھائی دی سارے میں ناکہ بندی ہو چکی تھی ۔ اب تو نواب صاحب کی ذرا سٹی گم ہوئی ۔ لیکن پھر اُن کو خیال آیا ۔ کہ نئی سڑک سے ایک گلی حوض قاضی کے پرے جا کے نکلتی ہے ۔ گاڑی کو سائیس کے حوالے کر کے نواب صاحب معہ میرا جن کے پیدل روانہ ہو گئے ۔

"یہ حرامزادوں نے اچھا ڈھونگ بنایا ہے ۔ آزادی! آزادی! بے ایمان کہیں کے دیکھتے نہیں ۔ کہ حکومتِ برطانیہ میں کیسے امن اور

چین سے رہتے ہیں۔ لیکن ان کمبختوں کو سمجھائے کون؟"

میر صاحب بہت بگڑ کر بولے

"جی ہاں۔ یہ سب [illegible] ۔ سارے ملک کو تہ و بالا کر رکھا ہے۔ سارا اطمینان اور سکون کھو دیا۔ کیا اسی کو آزادی کہتے ہیں؟ رعیت ساری الگ بگڑ بیٹھی۔"

"جی ہاں! جس کرایہ دار کو دیکھئے سیدھے منہ بات نہیں کرتا۔ اور اولاد ہے۔ کہ الگ ستیاناس ہو گئی۔ بڑوں کو بھی اِزار میں ڈال کر نہیں پہنتے۔"

جب یہ دونوں گھر پہنچے۔ تو مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ دور سے ایک آدھ بار بندوقوں کے چھٹنے کی آواز آئی۔ لیکن پھر سناٹا چھا گیا۔ نواب صاحب اور میر ابّن باتوں میں اس طرح مشغول ہو گئے۔ جیسے کوئی خاص بات ہوئی ہی نہ تھی۔

کھانے سے فراغت پا کر بیٹھے ہی تھے۔ کہ نواب صاحب کے دوست مرزا فرحت اللہ بیگ آ نکلے۔

"نواب صاحب آپ نے سنا۔ آج تو گولی چل گئی۔ سُنا ہے۔ سَو سے اوپر آدمی مرے اور زخمی ہوئے۔"

"جی ہاں، ہم بھی گھر گئے تھے۔ وہ تو خیریت ہو گئی۔ اچھا کہیئے۔

اب کیا حال ہے ؟"

"اب تو آدمی کا بچّہ بھی فتحپوری سے لے کر فوارے تک دیکھنے میں نہیں آتا۔"

"اجی صاحب اور کیا؟ میر ابّن بولے، گولی کے سامنے بھی کوئی ٹھیر سکتا ہے؟ ان حرامزادوں کو اسی کی ضرورت تھی۔"

اب رات کے دس بج چکے تھے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ گھر چلے گئے۔ ہوا خوشگوار تھی۔ نواب صاحب کرسی میں لیٹے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ میر صاحب سامنے کی کرسی میں آرام کر رہے تھے۔

نواب صاحب بولے:-

"ہاں بھئی، آج پچھمی بائی کا آدمی آیا تھا۔ کہتی ہے۔ کہ عرصہ سے حضور سے ملاقات نہیں ہوئی۔ اگر اجازت ہو۔ تو خود حاضر ہوں کیا رائے ہے ؟"

اس بات کو سنکر میر صاحب اپنی کرسی میں سنبھل بیٹھے، اور ذرا تپاک سے کہا:-

"بسم اللہ!"

"چلو بھئی خود ہی کیوں نہ چلیں ؟ رات پر کیف ہے۔ دوسرے وہ آدمی کہتا تھا۔ کہ آج کل پچھمی بائی کی کوئی بہن بھی آئی ہوئی

ہے۔ ذرا اُس کی بھی چاشنی چکھیں"۔

غرضکہ دونوں گھر سے چلدیئے۔ سڑک پر بالکل سناٹا تھا۔ جیسے رات بہت گئی ہو، یہاں تک کہ ایک کتا بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ ہوا میں خنکی تھی، اور اُن کے ہاتھوں میں پھولوں کے گجرے ایک مست کر دینے والی بھینی بھینی خوشبو پیدا کر رہے تھے۔

جب وہ قاضی کے حوض پر پہنچے۔ تو اُنھوں نے دیکھا۔ کہ سپاہی چار پائیوں پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

چاوڑی کے نکڑ پر اُن کو ایک لاش خون میں لتھڑی ہوئی بھیانک اور کریہہ منظر، ابھی تک پڑی ہوئی دکھائی دی۔ اور ایک اندھی بڑھیا اور ایک اپاہج فقیر، دونوں لاغر اور کمزور، محض ہڈیوں کے ڈھنچر، بھوک اور پیاس کے مارے، دیواروں سے ملے ملے دبلے پاؤں چوروں کی طرح اجمیری دروازے کی طرف جارہے تھے۔ . . . .

اُستاد شمّو خاں

(۱)

اُستاد شمّو خاں پہلوان کی اب تو خوب چین سے گذرتی تھی۔ کئی ایک اکھاڑے مار لینے سے نام ہو گیا تھا۔ کام بھی خوب چل رہا تھا۔ گھر میں بیوی سلمہ بٹنی تھیں، اور صرف دو بچے تھے۔ ورق کوٹنے سے بافت کافی ہو جاتی تھی۔ یار دوست تھے، فکر پاس نہ پھٹکتا تھا۔ اور اس کے علاوہ بدھو، دُرگی چماری کی لڑکی، عیش کرنے کو اللہ میاں نے پھوکٹ میں دے رکھی تھی۔ وہ کم عمر اور خوبصورت تھی۔ اس کا سڈول اور بھرا ہوا جسم، اس کا گندمی رنگ جس میں ایک ہیرے کی سی دمک تھی، اس کی بڑی بڑی مست آنکھیں، غرضکہ اُس کی ہر چیز موزوں اور لاجواب تھی۔ انسان اِس سے زیادہ کیا چاہ سکتا ہے؟ تموّل اور اوپر سے یہ مفت کا عیش۔ شمّو خاں روز ایک ہزار ڈنڈ بیٹھک نکالتے۔ اور خوب گھی پی پی کر دنبے کی طرح موٹے اور چکنے ہو گئے۔

لیکن انکو ایک فکر برابر ستایا کرتا تھا۔ ان کے گھر کے سامنے ہی شیخ نور الٰہی "کرخندار" رہتے تھے۔ اُن کو اُستاد شمّو خاں کی طرح کبوتروں کی بڑی دھت تھی، اور اُستاد سے اُن کی صید بندھی ہوئی تھی۔ شیخ نور الٰہی شمّو خاں کو بڑھتا دیکھ کر دل ہی دل میں بہت جلتے تھے۔ اور یہ جلن اس لئے اور بھی بڑھ گئی۔ کہ اُستاد شمّو خاں نے نہائیت عمدہ اور تنکڑے پیٹھے تیار کرنے شروع کر دیئے۔ جو حالانکہ محض تفنّنِ ہلکے ہی ہوتے تھے۔ لیکن بازی میں ہمیشہ شیخ جی کے شیرازی اور چپ کبوتروں کے جھلڑ کو نیچا ہی دکھاتے۔ اور ہر لڑائی میں شیخ جی کے ایک آدھ پیٹھے کو ضرور گھیر چپیک لاتے۔ پہلے تو چونکہ شروع شروع کا معاملہ تھا۔ شمّو خاں نے ایک آدھ بار شیخ جی کے کبوتر واپس کر دیئے" لیکن جب انہوں نے دیکھا۔ کہ یہ تو حد سے ہی گزرا جا رہا ہے۔ تو دینے سے صاف انکار کر دیا۔ اور کہا کہ وہ اب تو چوک پر بکیں گے۔ یہ سُنکر شیخ جی اور بھی آگ بگولہ ہوئے۔ جب تک یہ معاملہ آپس ہی میں تھا۔ تو اتنی برائی کی بات نہ تھی۔ لیکن کبوتروں کا چوک پر جانا نہ صرف شیخ جی کی شان کے خلاف تھا۔ بلکہ اس سے اُن کے نام پر بٹہ آتا۔ اُنہوں نے شمّو خاں کو روپیہ روپیہ دو دو روپیہ اپنے کبوتروں کے دینے کو کہا۔ لیکن شمّو خاں بولے :-

"میاں مجاز تو درست ہیں ؛ ہوش کی آؤ۔ اب تو کبوتر چوک سے ورے نہیں ملتے۔ لمبے بنو" ۔ ۔ ۔

کبوتروں کی مار کھا کھا کے شیخ جی کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ کہ کیا کریں۔ حالانکہ وہ قیمتی سے قیمتی اور اعلیٰ سے اعلیٰ پٹھے خرید کر لاتے۔ لیکن اُنکو بھڑی دی نہیں کہ شمو خاں نے جو اس تاک میں رہتے تھے۔ اپنے کبوتروں کو شنشکارا۔ جو شکرے کی طرح بھاگ کر عین شیخ جی کے بیٹھتے بیٹھتے کبوتروں کے سروں پر اس زور سے جھپکی لیتے کہ اُن کے سارے جھلڑ کو پلٹیاں کھاتے ہوئے دور لیجاتے۔ شیخ جی بیچارے بہت ہا و ہا و کرتے۔ لیکن شمو خاں کے کبوتر اُن کو کہاں نکلنے دیتے تھے۔ جب شیخ جی کے کبوتر بالکل شل ہو جاتے۔ تو شمو خاں اپنے کبوتروں کو آواز دیتے۔ ادھر شیخ جی کا کلیجہ آؤ آؤ کرتے کرتے پھٹا جاتا۔ بیچارے اس قدر بدحواس ہو ہو کر چیخنے۔ کہ ہاتھ ہلا ہلا کر زمین سے گز دوں اچھل اچھل جاتے۔ اور بجائے باجرے کے مٹھیاں بھر بھر کے باجرہ ہوا میں اچھال دیتے۔ لیکن شیخ جی کے کبوتر اس قدر بے جان ہو جاتے۔ کہ نئے پٹھوں کا تو کیا کہنا۔ اُن کے گردان کبوتروں میں سے بھی ایک آدھ شمو خاں کے ہاں گر جاتا۔ شیخ جی اپنے کبوتروں کو چھوڑ کر اُچک اُچک کے منڈیر پر سے دیکھتے۔ کہ اُن کا کیا حشر ہوا

لیکن شمّو خاں کو چھپکا مار نیکی بھی نوبت نہ آتی۔ اور شیخ جی کی ساری ٹکڑی پکڑی جاتی۔ اور پھر بیچارے شیخ جی اپنا سر پکڑ کر بیٹھ جاتے۔ شمّو خاں نے تو اُن کے کبوتروں کا چھت پر سے اُٹھنا ہی دوبھر کر دیا تھا۔ جب شیخ جی نے دیکھا۔ کہ اُن کی کسی طرح نہیں چلتی۔ اور شمّو خاں سے اس بُری طرح مار کھائی ہے۔ تو وہ شمّو خاں کو کسی نہ کسی طرح نیچا دکھانیکی فکر میں رہنے لگے۔ اکثر میر سعد اللہ سے، جو پنشن لینے کے بعد دلّی ہی میں واپس آکر رہنے لگے تھے۔ اور میر محلّہ کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ چاچا کے شکایتیں کیں۔ لیکن میر صاحب سمجھدار اور سنجیدہ آدمی تھے۔ وہ اس معاملہ میں نہ پڑے۔

(۲)

ایک روز ایسا اتفاق ہوُا۔ کہ جھُٹ پُٹے کے وقت شیخ جی چاوڑی بازار میں چلے جا رہے تھے۔ کہ پیچھے سے کسی نے آواز دی:

"اے میاں شیخ جی، اے میاں شیخ جی، اجی ذرا ٹھیرو۔ تو ہم بھی آ رہے ہیں"

شیخ جی نے پلٹ کر دیکھا۔ اُن کے دوست فاضل خاں تیز تیز قدم رکھتے ہوئے اُن کی طرف آ رہے تھے۔

"واہ میاں باشا۔ تم تو اللہ یا نے سر پہ پیر رکھے جا رہے تھے!"

"ہاں میں تو مزے میں ہوں، تم سناؤ یہ کیسے حیران نظر آ رہے ہو"

"میاں کیا پوچھتے ہو۔ ذری دیر ہوئی۔ ایک نیا خال پٹھا کھولا تھا۔ کہ اِس حرامزادے شمّو خاں نے مار لیا۔ اِسکی تلاش میں جا رہا ہوں"

"لو، اس پہ یاد آیا۔ میاں کچھ اور بھی تمہارے گوش گذارش ہوا: شمّو خاں کی اِس بُدھو سے آشنائی ہے۔ شاید تم نے بھی اِس لمڈیا کو دیکھا ہوگا۔ وہ چماری والی۔ میاں یا نشا لمسڈیا تو خُوب زوروں پر آئی وی ہے۔ انار نارنگیاں۔۔۔۔۔"

"کیا میاں سچ مچ کے رہتے ہو؟"

"اور نہیں تو کیا۔ میں نے خود اِن دونوں کو محوِ لیت کرتے دیکھا ہے"

"ملاؤ یار فورسے کا ہاتھ! یہ تو اللہ یا نے خُوب سُنائی"

فاضل خاں اس اچانک تپاک سے ذرا بدکے لیکن شیخ جی کا ہاتھ بڑھا ہُوا دیکھ کر اپنا ہاتھ اُن کے ہاتھ میں دیدیا۔ اور قہقہہ مارنے لگے۔

"ارے یار یا نشا بات کیا ہے؟ میں تو اللہ یا نے گھبرا گیا"

شیخ جی کے مُرجھائے ہوئے چہرہ پر رونق آ گئی تھی۔ انہوں نے اِدھر اُدھر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اور ایک کوٹھے کی طرف آنکھ مارتے ہوئے کچھ خوشی سے کچھ مُسکراتے ہوئے کہا۔

"ارے یار میں نے کہا چاوڑی تو آج بڑی رونق پر ہے"

"لیکن یار تم نے یہ تو بتایا نہیں۔ کہ یہ اچانک ماجرا کیا ہو گیا!"

"ارے یار کچھ نہیں۔ تم جانتے ہو۔ میری وِس حرامزادے شمو خاں سے چلی وی ہے۔ جب قبوتر کھولے تہیں کہ وِس نے . . ."

اتنے میں پیچھے سے ایک ٹریم آ گئی۔ اور سامنے سے کچھ تانگے، اور اوپر سے ایک موٹر۔ فاضل خاں اور شیخ جی باتوں میں اس قدر محو تھے۔ کہ قریب تھا۔ کہ کچل جاتے۔ جب موٹر کی آواز زور سے اُن کے بالکل سامنے سے آئی۔ تو کود کر شیخ جی ایک پٹڑی پہ بھاگ گئے۔ اور فاضل خاں دوسری پٹڑی پہ اور اُن کی بات ادھوری ہی رہ گئی . . . .

چوک پر پہنچ کے شیخ جی اِدھر اُدھر پنجروں پہ نظر ڈالتے ہوئے بھیڑ بھڑکا میں کھو گئے۔ اُستاد شمو خاں کے پاس سے گزرتے وقت اُنھوں نے ایک نگاہ اُن کے پنجرے پر اپنے کبوتروں کو بھانپنے کے لئے ڈالی۔ اور دوسری نگاہ میں غیظ و غضب سے خود اُستاد کے چہرے کو حقارت اور غصہ سے دیکھا۔ پھر اپنے دوست فاضل خاں کے الفاظ یاد کر کے مُسکرا دیئے۔

اتنے میں برابر سے حکیم نظیر آ نکلے۔

"ارے میاں شیخ جی، آج تو تمہارے بہت سے کبوتر دکھائی دیتے ہیں۔ یہ کیا بات ہے؟ سب کے سب ہی گر گئے؟"

"حکیم صاحب کیا پوچھتے ہیں آپ۔ ذری دیر ہوئی۔ کہ نئے پٹھے

کھولے تھے۔ ایک آدھ ہی بھڑی دی ہوگی کہ بس . . . شموخاں . . "

"او ہو شیخ جی بڑا افسوس ہوا۔ آج تو اُستاد شموخاں نے آپ کا دھڑ بٹھا دیا۔ میاں ذرا ہلدی کا گھسا دیکر چکناؤ تو دو، پھر دیکھیں گے۔ کیسے گرتے ہیں۔"

برابر سے آکر بابو اکرام الدین نے شیخ جی کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور اظہار افسوس کرنے لگے۔ شیخ جی ان باتوں سے زمین میں گڑے جاتے تھے۔ غصہ سے سُرخ ہو گئے۔

"اجی حکیم صاحب میں نے کیا یہ کس طریوں کی کبوتر بازی ہے؟ کوئی وَخت بھی تو ایسا نہیں ہوتا کہ نئے پٹھوں کو بھی چکر دے سکیں۔ اجی یہ بھی کوئی بات چیت ہے، بس حرامزادے . . ."

"ارے میاں شیخ جی ذری اس خال پٹھے کا ملاحظہ کرنا۔ کیا پھڑکتا واجنا ور ہے!!"

بھیڑ میں سے دھکا پیل کرتے ہوئے صدیق بہشتی نے آکر کبوتر والا ہاتھ شیخ جی کی طرف بڑھایا۔ اور ذرا گردن ٹیڑھی کرکے شیخ جی کی آنکھوں کو دیکھنے لگا۔ جو کبوتر میں گڑی ہوئی تھیں۔ شیخ جی نے کبوتر کی گردن مروڑی، سینہ پکڑکے اُس کو پھڑپھڑایا۔ پر کھولے، ٹانگیں دیکھیں، چونچ کا معائینہ کیا۔ اور حکیم صاحب کی طرف بڑھا دیا۔ انھوں

نے بھی بیچارے کی اسی طرح دُرگت بنائی۔ پھر کبوتر بابو اکرام الدین کے ہاتھوں میں پہنچا۔ غرضیکہ بڑی دیکھ بھال کے بعد کبوتر پھر شیخ جی کے پاس واپس آیا۔

"بھئی پٹّھا تو خوب ہے۔"

"ارے یار کس کا مارا؟" شیخ جی نے بڑے استعجاب سے پوچھا۔

"اجی کیا پوچھو ہو آپ۔" اور پھر شیخ جی کے مُنہ سے مُنہ لگا کر کہا:۔ "استاد شمّو خاں کا۔"

"آہا۔ اجی بابو جی آج تو بڑے موذی کا پا مار لیا! اچھا یار کن داموں کا ہے؟"

صدیق بہشتی بولا:۔

"اجی شیخ جی کدھی آپ سے بھی کوئی نرالی بات ہو سکتی ہے۔ جو خوشی ہو۔ لیکن ابھی ابھی کلّن ایک دھیلی دے رہا تھا۔"

"اچھا یار اب تو مُلّا جی کے پنجرے میں چھوڑ دے۔ دام پھر دیکھے جائیں گے۔"

صدیق بہشتی بہت خوش خوش ملّا جی کے پنجرے کی طرف چل دیا۔ اُدھر سے اُس کا دوست کلّن آنکلا، اور بولا:۔

"ارے یار باشتّا سودا تو خوب پٹایا۔ اور اُس نے صدیق کے

کندھے پر ایک تھپیڑ مارا۔

"ارے یارو کیا پوچھ رہے ہو۔ شیخ جی کی آنکھوں میں دھول ڈال دی۔ پٹھا ون ہی کا تھا۔ استاد شمو خاں کی ٹکڑی میں سے کٹ کر بھٹک رہا تھا۔ میں نے جو اپنے کبوتروں کو پھڑکایا۔ تو سالہ گولے کی طرح یوں گر پڑا۔ اور اللہ یا نے شمو خاں کا کہہ کے ون ہی کے متھے دے پٹخا!"

یہ کہکر صدیق نے اس زور سے کلن کی پیٹھ پر ہاتھ مارا۔ کہ وہ اچھل گیا۔

"وا یا نشا خوب چونا لگایا!"

اور دونوں بڑے زور سے ہنستے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

(۳)

محلہ میں پہنچکر شیخ جی بجائے سیدھے گھر جانیکے شیخ محمد صادق کے ہاں پہنچے۔ اور چھوٹتے ہی ان کو اپنی وہ گفتگو سنائی۔ جو فاضل خاں سے اُستاد شمو خاں کے بارے میں ہوئی تھی۔ پھر کچھ دیر ادھر اُدھر کی باتیں کرکے اپنے گھر واپس آ گئے۔

کچھ ہی روز کے عرصہ میں اُستاد شمو خاں اور بدھو کے بارے میں چہ می گوئیاں ہونے لگیں۔ لیکن لوگوں نے اس بات کی کوئی خاص پروا نہیں کی۔ اُستاد بہت ہر دلعزیز تھے، اور لوگ جو شمو خاں کے سے موقعہ

کی تلاش میں رہتے تھے۔ یہ سب باتیں سُنکر خاموش ہو رہے۔
مگر شیخ نورالٰہی اسی تاک میں تھے۔ کہ موقع پاکر اُستاد شمّو خاں کو نیچا دکھائیں۔ اور بھرے بازار ذلیل کریں۔ اِس تگ و دو میں وہ اپنی چیند کو بھی بھُول گئے۔ اس خوشی اور اُمید میں کہ ایک نہ ایک روز وہ استاد شمو خاں سے بدلہ لے ہی لیں گے وہ ذرا اور اکڑ کر چلنے لگے۔
وہ اِس خیال کو بھی نہیں بھولے تھے۔ کہ میر سعداللہ سے اس بات کا تذکرہ کر دینا ضروری ہے۔ ایک روز اس بات کا موقعہ بھی ہاتھ آ گیا چنانچہ رات کے کوئی نو بجے شیخ جی حیران و پریشان میر صاحب کی بیٹھک میں پہنچے۔
"اسلام علیکم"
"وعلیکم السلام شیخ جی۔ بہت دنوں میں تشریف لائے۔ مزاج تو اچھے ہیں"
"آپ کی مہربانی ہے۔ ذری کاروبار سے فرصت نہیں ہوئی"
کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد بولے:۔
"اجی میر صاحب وِس شمّو خاں نے تو حربان کر رکھا ہے۔ آج شام کو میں ذری یادگار نوڑی چلا گیا تھا۔ کہ میرا ایک بھٹکا وا کبوتر آن نِکلا۔ گھر میں سے نیک بخت نے کبوتر کھول دیئے کہ دِتنے میں صاحب وِس

شمّو خاں نے ایک پتھر میرے گھر میں پھینکا۔ اجی صاحب وہ تو بس بخیریت ہی ہو گئی نہیں تو وِس قتل سے وِس نیک بخت کا مغز ہی کھُل گیا ہوتا۔ وہ بیچاری بک بول کر چپ کر گئی۔ اور اس پر اور سنئیے۔ اب تو ہماری بہو بیٹیوں کی آبرو کا بھی کچھ ٹھکانا نہیں۔ آپ کے بھی شاید گوش گذارش ہوا ہو کہ وِس شمّو خاں کی وِس بدّھو رگی چماری کی لڑکی سے آشنائی ہے۔ اب کہیئے؟"

لیکن میر صاحب بولے:۔

"شیخ صاحب اپنے فعل اپنے ساتھ ہیں۔ آپ کیوں کسی کو کانوں میں گھسیٹتے ہیں؟ جو جیسا کریگا ویسا بھرے گا۔ آپ شمّو خاں سے واسطہ ہی نہ رکھئے!"

شیخ جی بولے:۔

"اجی صاحب یہ تو جو کچھ بھی آپ عرض کرتے ہیں ٹھیک عرض کرتے ہیں۔ لیکن میں تو یہ فرماتا ہوں کہ وِتّی دور کیوں جائیے یہیں سے لے لو۔ جیسے وہ مثل مشہور ہے جو آپ نے بھی سُنی ہو گی۔ کہ ایک مچھلی سارے تلاؤ کو گندا کر دیتی ہے۔ تو بس یہ ہی بات چیت ہے۔ اور وِس حرامزادی لمڈیا کے ماں باپ بھی کچھ نہیں بولتے۔ صاحب وہ تو سارے لمڈوں کو خراب کر دیگی۔ وِسکی تو چٹیا پکڑ کر بارہ پتھر باہر پھنکوانا چاہیئے!"

اس گفتگو کے بعد شیخ جی کچھ میر صاحب سے برگشتہ خاطر ہو گئے۔ اور خود ہی اُستاد شمّو خاں کی تذلیل کے موقعہ کی تلاش میں رہے . . .

(۴)

اپریل کا مہینہ تھا۔ اور گرمی روز بروز زور پکڑتی جاتی تھی۔ گرمیوں کی دوپہر میں ایک عجیب کیفیّت ہوتی ہے۔ ایک مستی اور نفسانیّت ایک گہرا نفسانی جذبہ انسان کے سارے جسم میں سرایت کر آتا ہے۔ اُستاد شمو خاں اپنی دوکان میں بیٹھے ہوئے جو اُن کے گھر ہی کا ایک کمرہ تھا۔ ورق کوٹ رہے تھے۔ گلی کے نکّڑ سے ایک ٹین والے کے ٹین پیٹنے کی آواز متواتر اور یکساں چلی آ رہی تھی۔ دُور سڑک پر ٹریم کی ہموار اور کوفت دہ گھڑگھڑاہٹ بار بار ہوتی تھی۔ کچھ اور شور و شغب اور سودے والوں کی مسلسل آوازیں ایک یاس اور نا اُمیدی کا سا سماں پیدا کر رہی تھیں، ایک ایسی مسلسل ہمواری کا جو گرمیوں کے دنوں کی ایک خاص چیز ہوتی ہے جس کا مُنجمِد سلسلہ صرف انسان کے نفسانی خیالات کو اور بڑھا دیتا ہے۔

ایسے حال وقت میں جبکہ ذرا سے اشارہ سے انسان کے خیالات آگ کی طرح بھڑک اُٹھتے ہیں۔ بدّھو کی جھلکی اُستاد شمّو خاں کے لئے دیا کا کام کر گئی۔ لپک کر اُستاد شمّو خاں نے آدھے بند کواڑوں کو کھولا

اور گردن باہر نکال کے جھانکنے لگے۔ جب اُنہوں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑا کے دیکھ لیا۔ کہ کوئی نہیں ہے۔ تو اشارہ سے بدّھو کو بلایا چٹ بڑھ کر اپنے بیٹھنے کے گدّے کے نیچے سے ایک اٹھنی نکال کر اُس کے ہاتھ پہ رکھی۔ اور اُسے سامنے والے گودام کی طرف اشارہ کیا جو خالی پڑا ہوا تھا۔ اور جس میں اُستاد شموّ خاں صبح کو کسرت کیا کرتے تھے۔ اسکے بعد انہوں نے اپنا گھر کا سلا ہوا بنیان پہنا۔ اور اپنی تہمند کو سنبھالتے ہوئے دوکان میں سے نکلے۔ اور کواڑ بند کرنے لگے۔

اتفاق کو انسان کی زندگی میں بڑا دخل ہے، اور اکثر اُس کی تمام کوششوں اور تدبیروں پر پانی پھیر دیتا ہے۔ اتفاق میں بڑے کمال کی بات یہ ہے۔ کہ وہ ہر کسی شکل میں آموجود ہوتا ہے۔ اور اس دوپہر کو جب بدھو سڑک کو پار کر رہی تھی۔ اور اُستاد شموّ خاں ایک ہاتھ اپنے تہمند پر رکھے ہوئے اپنی دوکان کے کواڑ بھیڑ رہے تھے۔ تو شیخ نوراِلٰہی اتفاق کی صورت اختیار کئے گلی کے نکڑ پر نمودار ہوئے۔ جیسے ہی انہوں نے اپنی نگاہ کے سامنے اُستاد شموّ خاں اور بدھو دونوں کو دیکھا۔ تو وہ ٹھٹھکے اور ایک مکان کی آڑ میں ہو کر یہ دیکھنے لگا۔ کہ اب یہ دونوں کیا کرتے ہیں۔

جب اُنہوں نے دیکھ لیا۔ کہ پہلے بدھو اور اسکے پیچھے پیچھے

اُستاد شمو خاں خالی گودام میں داخل ہوئے تو بغیر کچھ اور دیکھے بھالے شیخ جی پنجوں کے بل بھاگتے ہوئے ایک اور گلی میں غائب ہو گئے اُنھوں اپنے دوست شیخ محمد صادق کے کارخانہ میں دم لیا۔ جہاں اتفاق سے مرغوں کا کارخانہ گرمی پہ تھا۔ شیخ نورالٰہی کی "سنسنی خیز" خبر سُن کے سب . . . شیخ جی کی رہبری میں مقام کارزار کی طرف بولائے ہوئے روانہ ہو گئے۔ جلدی میں ایک صاحب کی بغل میں ایک اصیل مرغا دبا چلا آیا۔ وہ تھوڑی دور چلے تھے۔ کہ مُرغے نے زور سے ایک قیں کی۔ بس بیچارے مرغ کی آواز نکلنے ہی کی دیر تھی۔ کہ شیخ جی فوراً پلٹ پڑے اور بہت نیلے پیلے ہو کر بولے:-

"میاں تمہاری عقل بھی درست ہے۔ ابھی سارا کھیل بگڑ گیا ہوتا آیا کہیں کا مُرغ باز !"

"میاں کیا بک رہے ہو؟ مُنہ سنبھال کے بولیو۔ ابھی مجاز ٹھیک طرح یوں کر دوں گا!"

"ابے کیا کہا؟ آ تو ذری میدان میں!"

اور یہ کہکر شیخ جی نے آستینیں چڑھانی شروع کر دیں . . .

وہ تو خیر گذری کہ شیخ محمد صادق اُن کے ساتھ تھے۔ اُنھوں نے دونوں کو ذرا ٹھنڈا کیا اور بیچ بچاؤ کرایا نہیں تو سر پھٹول ہی کی نوبت آتی۔

اس کے بعد ساری ٹولی پنجوں کے بل خالی گودام کی طرف اس طرح بڑھی جیسے کوئی شکاری بڑی احتیاط سے اپنے شکار کی طرف بڑھتا ہے۔ وہ اتنے چپکے چپکے چل رہے تھے۔ کہ اُن کے دلوں کے دھڑکنے کی آواز دھائیں دھائیں سنائی دیتی تھی۔

گودام کے نزدیک پہنچکر سب نے کواڑوں پر کان لگا کے سُننے کی کوشش کی۔ لیکن شیخ جی نے سب کو اپنے ہاتھوں سے پیچھے ہٹایا اور آنکھیں نکال نکال کر انگلی کے اشارے سے سب کو چپ کرانے لگے۔ ادھر لوگ سننے کے اس قدر مشتاق تھے۔ کہ سب کے سب کواڑوں کی طرف بڑھے آتے تھے۔ بڑی مشکل سے شیخ جی نے اُن سب کو ایک کونے میں چپکا کر کے کھڑا کر دیا۔ لیکن ان کی بیتاب نگاہیں کواڑوں پر گڑی ہوئی تھیں۔

اب شیخ جی کان لگا کر سننے لگے۔ گلی کے نکڑ سے ٹین پٹنے کی آواز آ رہی تھی۔ دوسری سڑک پر ٹریم کی گھڑگھڑ اور سودے والوں کی آوازیں چلی آ رہی تھیں اندر ایک سُرسُر کی سی آواز کے علاوہ کچھ نہ سُنائی دیتا تھا۔

جب شیخ جی کو کوئی بات بھی صاف نہ سُنائی دی تو اس قدر بیتاب ہوئے کہ اُنھوں نے گودام کے کواڑوں کو دھکا دیدیا۔ جو اتفاق سے اُستاد شمّو خاں اندر سے بند کرنا بھول گئے تھے۔ کواڑ چوپٹ

کھُل گئے اور سب کے سب ایک دم سے آگے بڑھے . . .
سامنے اُستاد شمّو خاں سینہ نکالے کھڑے تھے۔ شیخ نور الٰہی کا
مسخ چہرہ خوشی سے سخت ہو گیا۔
"کیا سالہ ایڈی پولو بنا کھڑا ہے!"
"لیکن وہ کہاں ہے 'ڈھڈو'؟"
اور سب نے مایوسی اور غصّہ سے شیخ جی کی طرف پلٹ کر دیکھا
ایک آدھ نے گودام کے کونوں پر نظر ڈالی۔ لیکن بدھّو کا نام نشان بھی نہ
تھا۔ شیخ جی شرم اور غصّہ سے جل کر کباب ہو گئے۔
"حرامزادہ کسی طرح بچ بھاگا۔ لیکن اگر توڑ نہ کیا ہو۔ تو شیخ
فضل الٰہی کا نہیں اُلّو کا کہنا!"
اُستاد شمّو خاں کے مُنہ سے ایک قہقہہ کی آواز بلند ہوئی۔ شیخ نور الٰہی
کے پژمردہ چہرہ سے ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔
لیکن زندگی اپنی پُرانی رفتار سے اُسی طرح بہتی رہی۔ وہی
گلی کے نکڑ سے ٹین والے کے ٹین پیٹنے کی آواز آ رہی تھی، وہی دور
سڑک پر ٹریم کی گھڑ گھڑ اور وہی سودے والوں کی آوازیں ایک
یاس اور نا اُمیدی کا سماں پیدا کر رہی تھیں . . .

شادی

(۱)

میاں اکبر کا نکاح ہوگیا۔ دلہن کو بیاہ کرلے آئے۔ شادی میں کچھ کرّ و فر نہ تھا۔ بہت سادی، زمانۂ جدید کی شادی تھی۔ بہت ہی کم اور چیدہ براتی تھے۔ جب شہدوں کو اللہ آمین کی اجازت نہ ملی۔ تو انھوں نے بہت غل مچایا۔ بہت سے لوگوں نے اس دایمی رسم کو ٹوٹتا دیکھ کر ناک بھوں چڑھائی۔ اور افسوس کا اظہار کیا، اور غصّہ سے "جدیدیت" کو آپس میں بُرا بھلا کہا۔

میاں اکبر نے سہرا باندھنے سے پہلے ہی انکار کر دیا تھا۔ اس پر کچھ "بڈھی روحوں" نے خوب انگلیاں اُٹھائیں۔ لیکن میاں اکبر کی ضد تھی۔ کہ وہ نہ تو سہرا باندھیں گے نہ بھڑ کیلے کپڑے پہنیں گے۔ اور نہ اُن پُرانی رسموں مثلاً گاجا باجا گھوڑے پر چڑھنا شہدے وغیرہ وغیرہ، کو ہونے دیں گے جو ہمیں ہمارے آبا و اجداد سے ورثہ میں ملی ہیں۔ ورنہ شادی ہی نہ کریں گے۔ لوگوں کے اعتراض کرنے سے ہوتا ہی کیا ہے؟ شادی تو میاں اکبر کی تھی۔ نہ کہ اُن دنیا تو سی لکیر کے فقیروں کی جو اچھائی میں بھی بُرائی نکالے بغیر باز نہیں آتے۔ اور پھر اُن کے سُسرے بھی اُن کی شرائط کو پُورا کرنے

پر تیار تھے۔ تو پھر بقول شخصے جب میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔

بڈھوں کے غصہ کو سوچ سوچ کر میاں اکبر دل ہی دل میں بہت خوش ہو رہے تھے "بڑا شور مچاتے تھے نوجوانوں کو بہت گھونٹ گھونٹ کر رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ میں نے دکھا دیا۔ ناکہ کس طرح نوجوان بھی اپنی خواہشات پوری کر لیتے ہیں۔ بڑے آئے کہیں کے بڑے۔ بوڑھے" اور ان کو بھی بچپن کی سنی سنائی کہاوت یاد آ گئی اور دل ہی دل میں خوب ہنسے "بڑے بوڑھے اسردار جی کے سالے، امیر جی کے بھیا اور پردہ میں سے منہ نکال کے بولی اُنکی میّا ۔۔۔ تا تھنک تھنک تھنک۔ تا تھیا تھیا تھیا۔ شادی میری ہو گی، اُن کو کیا کہ کسطرح ؟ جس طرح میں چاہونگا ہو گی۔ اور پھر گویا جب میں اور میرے سسرے راضی تو کیا کرے گا قاضی"۔

اس میں شک نہیں کہ اُن کو اس بات کا قطعی علم نہ تھا۔ کہ اُن کی بیوی بھی راضی ہیں یا نہیں یا اُن کی مرضی کیا ہے . . . . . .

شادی پھرنے سے قبل بھی بڑے بڑے جھگڑے نکلے تھے۔ ولایت سے لوٹنے کے تین سال بعد تک تو میاں اکبر طے شدہ شادی کرنے پر تیار ہی نہ ہوتے تھے۔ یہ تو کیا اُس کے ذکر ہی سے کانوں میں اُنگلیاں دے لیتے۔ آخر تو اُس خطہ سے چلے آ رہے تھے۔ جہاں مرد اور عورتیں آزادی سے ملتے ہیں۔ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے جہاں جی میں آتا ہے پھرتے ہیں،

شادی خود لب پر ایک بوسہ دے کر اور انگلی میں ایک انگوٹھی پہنا کر
مزے اور محبت سے طے کرتے ہیں۔ صرف جب معاملہ طے ہو جاتا ہے
تو اپنے اپنے والدین کو خوشخبری سُنا دیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں۔ کہ یہ
نہایت ہی عمدہ اور مناسب بات ہے کیونکہ آخر کار لڑکے اور لڑکی ہی کو تو
زندگی ساتھ گذارنی ہوتی ہے۔ اور اگر اپنی پسند اور مرضی کا جوڑا نہ ہوا
تو زندگی دوبھر ہو جاتی ہے۔ اور پھر والدین اور اولاد کے خیالات میں
کتنا فرق ہوتا ہے؟ اتنا ہی جتنا کہ ماضی اور حال میں، موجودہ نسل اور
متقدمین میں، ایک میل اور دو میل کے فاصلہ میں۔ لیکن جس وقت اکبر
نے ہندوستان کے کنارے پر قدم رکھا تو دنیا ہی بدلی ہوئی پائی۔ جیسے جیسے
بمبئی سے دور ہوتے گئے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے پھرنا تو درکنار عورتوں کی
شکل دکھائی دینی بھی مشکل ہو گئی۔ کوئی ایسی عورت جس سے دل کی بات
کہہ سکیں۔ جو اُن سے اور اُن کے خیالات سے ہمدردی ظاہر کر سکے۔ دوا
کے لئے بھی مشکل سے ملتی۔ اب جوں جوں دن گذرتے گئے۔ اُن پر ایک غیر
معمولی اور عجیب قسم کی افسردگی اور پژمردگی چھانے لگی۔ اُن کے دل پر
ایک اندھیرا سا آ گیا۔ اور ایک لا انتہا ہی افسوس کی کیفیت اُن پر طاری
ہو گئی۔ جس طرف نگاہ دوڑاتے میاں اکبر کو سوائے ایک بنجر اور ویران بغیر
عورت کے ریگستان کے کچھ نہ دکھائی دیتا جس کے افق کی تکلیف دہ اور دل شکن

ہمواری کو توڑنے کے لئے ایک سرسبز درخت یا چٹان بھی نہ تھی۔ لوگوں سے ملنے لیکن اُن میں سوائے کٹّر پن گندی رسومات اور توہمات کے کچھ بھی نہ ملتا۔ سوائے "جدیدیت" کی برائی اور "قدامت" کی تعریف کے کوئی خوشگوار آواز نہ سنائی دیتی۔

جب باہر کچھ نہ ملا۔ تو لاچار اکبر کو اپنے ہی اندر بھروسے اور تسلّی کی تلاش کرنی پڑی۔ اُنہوں نے اپنے دل کے اندر دیکھا۔ لیکن وہاں ایک آگ سی سُلگ رہی تھی۔ جسکے دھویں نے انکے تمام اندرونی اعضاء کو دھندلا اور کالا کر دیا تھا۔ وہاں بھی کوئی تسلّی کی صورت نہ دکھائی دیتی تھی صرف ایک یاد کا دریا تھا۔ کہ اُمڈا آتا تھا۔ لیکن اندرونی آگ یاد کے پانی سے اور بھڑک اُٹھتی تھی۔ اُن کے دماغ میں انقلابی خیالات موجزن تھے اُن کے دلمیں ہوٹلوں کی راتوں اور نوجوان عورتوں کے ہونٹوں کی یاد کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ میاں اکبر کی یہ کیفیت ہوئی۔ کہ دیوانہ پن کے لگ بھگ آلگے اور موت کا خیال اُن پر ایک کالے بھوت کی طرح سوار ہو گیا۔ اُنہوں نے اپنے ڈی۔ ایچ۔ لارینس کے ناولوں کا مطالعہ دوبارہ اور سہ بارہ کیا لیکن لارینس نے اکبر کی لگی ہوئی آگ پر اور تیل ڈالدیا۔ اور ان کا دماغ اپنے ہاں کی عورتوں کی افسوسناک حالت پر اور ملک کے لوگوں کی دماغی، معاشرتی اور جنسی کیفیت پر غصہ اور افسوس سے کھولنے لگا۔ اُن کو ایک انگریزی جرنلسٹ

کے وہ الفاظ جو اس نے اپنے اسپین کے سفر کے بعد اپنے اخبار میں لکھے تھے یاد آئے۔ وہاں کی عورتوں کی بری اور افسوسناک حالت دیکھتے ہوئے اُس نے لکھا تھا۔ کہ کوئی ملک اُس وقت تک آزاد نہیں ہو سکتا جب تک کہ اُس میں سے فوقیتِ جنسی کا امتیاز نہ اُٹھ جائے۔ جب تک کہ اُس کی عورتیں پوری طرح آزاد نہ ہولیں جب تک کہ اُس کے نوجوان مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے شہروں کی سڑکوں اور باغوں کی روشوں پر آزادانہ نہ پھرنے لگیں۔ تہذیب کی نشانی، اُس نے لکھا تھا، دونوں جنسوں میں برابری باہمی اتفاق اور آزادی ہے۔

ان خیالات میں پانچ سال پرورش پانے اور دنیا دیکھنے کے بعد ناممکن تھا۔ کہ کسی ہونہار اور سوچنے والے شخص پر گہرا اثر نہ ہو، اور نا امیدی اور افسردگی ایک تلاطم برپا نہ کرے۔ لیکن ہندوستان کی اس وقت بہت ابتر حالت تھی، چاروں طرف غلامی اور تاریکی کا دور دورہ تھا اُسکی ناول نگاری انگلستان کی سترھویں صدی سے بدتر، اُس کی نثر انگلستان کی پندرھویں صدی کی طرح، اُس کی تنقید ویسی جیسی انگلستان میں اب سے سو برس سے زائد پیشتر "بلیک ووڈ میگزین" اور کوارٹرلی ریویو" کے ہاتھوں میں تھی، اُسکی شاعری آسکر وائیلڈ کے زمانہ کی سی، اُسکی جنسی حالت انگلستان میں پچھلی صدی سے بھی بدتر تھی چنانچہ اکبر کی حالت

ویسی ہی ہو گئی۔ جیسے کہ ایک اُس شخص کی ہو گی جو کسی طرح اسوقت سے سو اور دو سو برس پہلے کے زمانہ میں یکایک لیجا کر ڈالدیا جائے۔ ولایت سے ہندوستان آنے میں اتنا ہی فرق ہو گیا۔ جتنا کہ گذرے ہوئے ماضی میں پھینک دیئے جانے سے۔

اکبر کو اپنے موجودہ ماحول سے مانوس ہونے میں عرصہ لگا، اور اُنکے خیالات بدلنے میں تو اور بھی وقت درکار تھا۔ گو یہ مشکل ہے۔ کہ انسان کے خیالات پختہ ہو جانے کے بعد بدل جائیں۔ صرف اُنکا زور کم ہو جاتا ہے اور اکبر کے خیالات بھی ایک پہاڑی دریا کے چڑھاؤ کی طرح کچھ عرصہ کے بعد اپنا زور کم کرتے گئے۔ لیکن اُن کی روانی باقی تھی۔ جس کا بالکل بند کر دینا ناممکن ہے . . .

جب میاں اکبر کو نوکری بھی مل گئی۔ تو اُن کے اعزّہ نے اُنسے شادی کرنے پر زور ڈالنا شروع کیا۔ تین سال تک تو اُنھوں نے ہنسی میں ٹال دیا۔ جب لوگ اُن سے کہتے کہ شادی کر لو تو وہ یہی جواب دیتے۔ کہ کس سے کروں۔ "میاں لڑکیاں خدا کی دی بہت سی ہیں" لیکن اُنکا جواب ہوتا کہ میں اُن کو کیا جانوں؟ . . . لیکن بھوک کی مار بری ہوتی ہے۔ آخر چار و ناچار راضی ہو ہی گئے۔

(۲)

گو رسّی جل چکی تھی لیکن ابھی تک بل باقی تھا۔ انسان اپنے خیالات

کو گھونٹ سکتا ہے۔ لیکن اُنکو بالکل مسمار نہیں کرسکتا۔ اور حالانکہ اکبر کی مجبوریوں نے اُس کو مجبور کر دیا تھا کہ ملک کی حالت سے صلح کرلے لیکن رسّی کے بل کی طرح اُس کے خیالات باقی تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

دُلہن ان کے گھر میں آ گئی۔ پالکی میں سے نہ جانے کس نے اُتارا، اکبر نے تو انکار کر دیا تھا " آخر اُس کے بھی تو پیر ہیں۔ اپنے پاؤں سے کیوں نہ چلے ؟" آرسی مصحف وغیرہ بھی نہ ہوا۔ اب رات گئے دُلہن کو اُس کے کمرے میں پہنچا کر لوگ تھکے ہارے کونوں کھدروں میں گٹھریاں بن کر سو گئے۔

دُلہن کے ساتھ کی ماما دالان کے ایک کونے میں دیر تک دولھا کے آنیکا انتظار کرتی رہی۔ گھنٹوں کے انتظار کے بعد بھی جب دولھا کسی طرح نہ آئے تو بیچاری کڑیاں گنتے گنتے سو گئی۔

دلہن کو جسطرح چھپر کھٹ پر ڈالدیا تھا۔ بیچاری اُسی طرح گنڈلی مُنڈلی مارے پڑی تھی۔ ایکیلے کمرے میں وہ اور بھی سہمی جا رہی تھی۔ ایک تو تنہائی دوسرے زندگی کے زینہ کے موڑ پر اگلی سیڑھیوں کا خیال، اور اس پر اُس کاٹنے اور توڑ کے وقت کی جستجو۔ ایک عجیب خوف اُس کے دل کو مسوس رہا تھا۔ اس کشمکش و پیچ میں بہت دیر ہو گئی۔ ایک ایک لمحہ پہاڑ کی طرح کاٹے نہ کٹتا تھا۔ وہ حیران تھی کہ آخر دولھا میاں کیوں نہیں آتے " کیا میری شادی اس کمرے سے ہوئی ہے ؟" لیکن بہت دیر تک ہولنے اور پریشان

ہونے کے بعد اُس نے سوچا۔ کہ شاید شادی میں بھی ہوتا ہوگا۔ جب گھنٹے تنے ٹن ٹن ٹن کہیں دُور سے تین بجائے تو اُس کی مایوسی کا کچھ ٹھکانا نہ تھا "ہائے، میری قسمت پھُوٹ گئی! کوئی بھی مُوا دولہا نہیں آتا۔ لیکن شاید ایسا ہی ہونا ہوگا"۔ ۔ ۔ ۔

نکاح کے بعد ہی اکبر کے بے تکلف اور تجربہ کار "چچا زاد بھائیوں نے اُسکو گھیر لیا۔ اور نصیحت اور صلاح کاری میں مشغول ہو گئے۔ شادی کی اونچ نیچ بتائی۔ اور طریقہ طرائق سمجھانے لگے۔ لیکن اکبر نے کہا۔ "گو میں اس طرح شادی کرنے پر آمادہ تو ہو گیا ہوں۔ لیکن کبھی بھی شب عروسی کے کمرے میں جس پر ہر زن و بچہ کی نگاہ گڑی رہتی ہے بیوی کے ساتھ رات نہ گزارونگا"۔ "تو کیا ہنی مون' منانے جاؤ گے؟ بھئی پاگل تو نہیں ہو گئے ہو؟ ایسی بیوقوفی بھی نہ کرنا۔ اُس بیچاری کا کیا حال ہوگا؟ وہ کیا خیال کریگی! جو لوگ ایسی حماقت کرتے ہیں ہمیشہ پچتاتے ہیں۔ بلّو نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ کئی روز تک بیوی سے صرف "دوستی" ہی کرتے رہے۔ دیکھ لو نتیجہ کیا ہوا؟ آخر کو طلاق ہی ہوا"۔ لیکن اکبر نے کہا "اس طرح بیوی کے پاس جانا تو بالکل ایک طوائف کے پاس جانیکی طرح ہے۔ یہ سب باتیں دونوں کی مرضی سے ہونی چاہئیں"۔ "بھئی ان باتوں کو چھوڑو۔ یہ سب باتیں ہی باتیں ہیں۔ عمل اور خیال میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ یہ ولایتی خیالات کام نہیں آتے"۔ مگر اکبر ہٹ کے دھنی ان باتوں کو ماننے کیلئے

تیار نہ ہوئے۔ اُنھوں نے ہیولوک ایلس اور اور ماہرین نفسیات کے حوالے دینے شروع کئے" اکثر عورتوں کو ایسے ہی طریقے اختیار کرنے سے سیکس سے قطعی نفرت ہو جاتی ہے۔ اور وہ آیندہ مرد کی صورت سے نفرت کرنے لگتی ہیں"۔

اس قسم کے مباحثوں میں رات کے دو بج گئے، اور اکبر کے بھائی اُنکو زبردستی پکڑ کر گھر کے دروازہ تک چھوڑ گئے۔ اور تاکید کر گئے۔ کہ پانڈے جی پچتائیں گے۔ اور پھر چنے کی کھائیں گے۔ . . .

گھر میں گھس کر اکبر دبے پاؤں اپنے کمرے کی طرف چلے۔ اس وقت سناٹے میں سناٹا ہو گیا تھا۔ دن بھر کے تھکے ہوئے سب پڑ کر سو گئے تھے۔ اُنکے کمرے میں کچھ مہمان خراٹے لے رہے تھے۔ اکبر نے اِسکو غنیمت جانا۔ اور ایک پڑی ہوئی رضائی کو کھینچ ایک کونے میں زمین پر دراز ہو گئے۔

اُنھوں نے سونے کے خیال سے آنکھیں بند کریں۔ اُنکے دماغ میں ایک لڑکی کی تصویر پھر گئی۔ اس کا قد موزوں تھا، اُس کا جسم سڈول اور خوبصورت، اُس کے کوٹھے اُبھرے ہوئے تھے۔ اُس کی چال بہکتی ہوئی تھی، اُس کے خیال میں ایک مستی تھی۔ سال بھر ہوا۔ اکبر نے اس لڑکی کو دیکھا تھا۔ آج یہ لڑکی اکبر کی دلہن تھی . . . اکبر نے اور زور سے بھینچ کے آنکھیں بند کریں، لیکن وہ تصویر ایک مست خواب کی طرح اُن کے سامنے تھی اُنھوں نے آنکھیں کھول لیں اور خیال میں محو ہو گئے۔ لیکن ہر پھر کر پھر

خیالات اُسی لڑکی کی طرف رجوع ہوئے۔ اور اُن کے دل میں اُمنگ اور اُس لڑکی سے ملاقات کرنیکی خواہش پیدا ہوئی . . . اکبر نے کروٹ بدلکر پھر آنکھیں بند کرلیں، اور لڑکی کے خیال کو دور کرنے کے لئے اِدھر اُدھر کی باتوں کا خیال باندھا . . . اُن کو ایک کتاب کا، جو اُنھوں نے پڑھکر بڑی حد تک پسند کی تھی، خیال آگیا۔" ہماری سوسائیٹی کس قدر توہمات اور فضولیات سے بھری ہوئی ہے۔ رسوم نے نہ وبالا کر رکھا ہے۔ جو لوگ ہیں سب نکھٹو اور نکمے، اس شخص کی طرح جس کی نگاہ ہر وقت صرف اکبر کی ٹوپی اور اچکن ہی پر پڑتی تھی۔ آئے، گل و بلبل کے افسانے گائے، سگرٹ نوش فرمایا، اور چلے بنے۔ آئیے اکبر صاحب . . . میرا نام بھی تو اکبر ہے! عجیب بات ہے مجھے اس کا پہلے خیال نہیں آیا۔ کوئی ٹھمری، کوئی دادرا۔ واہ بی مُنّی جان، واہ۔ نخرے اور گرم مصالحہ۔ یہ بھی کیا کسی نے بات کہی ہے۔ نخرے (اوپر نیچے اڑتے ہوئے روئی کے گالے) اور گرم مصالحہ۔ لونگ اور کالی مرچ، سیاہی سفیدی میں سیاہی، دوات کی مٹی کی دوات، سرکنڈے کا قلم، اور تختی۔ تختی پہ تختی مولوی صاحب کی آئی کم بختی۔ مولوی صاحب اور حوروں کا خواب۔ گورا جسم، لمبی لمبی ٹانگیں، بیبا کی، نزاکت، حسن، حسن" . . . اور پھر وہی سڈول جسم اور اُبھرے ہوئے کولھے . . .

اکبر کے جذبات آگ کی طرح بھڑکتے جاتے تھے۔ وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ اور

پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر لیٹ گیا۔ اب اُس نے اپنے گھر کا خیال باندھ لیا صُوفے کو اور دیوار کی طرف لگاؤں گا۔ اور اُس کے اوپر کیوپڈ اور سائیکی تصویر ٹانگوں گا۔ کونوں کی میزوں پر سنگِ مرمر کی مورتیں، وہ پھولوں والی تصویر اُلٹے ہاتھ کی دیوار پر ہونی چاہیئے۔ اور بیکس کی صوفے کی سامنے والی دیوار پر۔ لیکن یہ سب تو حمیدہ کی رائے سے ہوگا۔ نہیں۔ یہ تو میں اُسی پر چھوڑ دوں گا۔ شام کو میں چپکے سے آؤں گا۔ وہ تصویروں کو ٹھیک کرتی ہوگی۔ میں پیچھے سے اُس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دوں گا۔ "کون؟ اکبر، میرے اکبر!" میں اُس کو پیار کروں گا۔ ہم دونوں صوفے پر ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈال کر بیٹھ جائینگے۔ وہ مجھ کو چائے بنا کر دیگی، میں اُسکی اُنگلیوں کو پیار کروں گا۔ ۔ ۔ ۔"

اکبر کے جذبات بھڑکنے گئے۔ اُس نے سوچا "جب میرے دل میں اس طرح حمیدہ کے خیالات آرہے ہیں۔ تو کیا اُس کے دل میں اسی طرح میرے خیالات نہ آرہے ہونگے؟ میں آخر اُس کے پاس اسی وقت کیوں نہ جاؤں؟ آخر کو وہ میری بیوی ہے۔ کیا میں اُس سے ملنے سے ڈرتا ہوں نہیں، ہرگز نہیں!"

اکبر جلدی سے کھڑا ہوگیا۔ اور انگنائی میں نکل کر دُلہن کے کمرے کی طرف چلا۔ چبوترے سے اُترتے وقت یکایک اُس کے دل میں

یہ خیال آیا، "شاید ظاہر داری کے لئے لوگ "انگارے" کی بُرائی کرتے تھے۔ ورنہ بہت سوں نے تو اُسے چھُپ چھُپ کر پڑھا، چوری سے۔ اسی طرح جیسے میں اپنی بیوی کے پاس چوری سے جا رہا ہوں۔ لوگ غالباً "انگارے" کو چوری سے پڑھتے تھے"! یہ سوچکر اُس کے چہرہ پہ مسکراہٹ کی ایک جھلک پھر گئی "جھوٹ۔ سب جھوٹ۔ لوگ اپنی زندگی جھوٹ سے بناتے ہیں"!

یہ سوچتے ہوئے اُس نے چبوترے کی سیڑھی سے پاؤں نیچے رکھا۔

گھنٹے نے کہیں دُور ٹن ٹن ٹن بجائے۔

بہار پھر آ گئی۔

ہوا میں ایک نرمی، ایک عجیب دلکش خوشگواری ہے۔ سارا باغ ولایتی مٹر کے رنگین پھولوں سے مہک رہا ہے۔ اور کھیتوں میں سرسوں پھولی ہوئی ہے۔ یہی جی چاہتا ہے۔ کہ بس دل آویز نیلگوں آسمان کے نیچے ہری ہری نرم گھاس پہ سر رکھ کے اسطرح فضا کے نشہ سے مست ہو کر لیٹ جاؤں۔ کہ پھر کوئی مجھ کو اس دنیا کی دل شکن حقیقت میں کبھی بیدار نہ کر سکے۔

ہماری بہار کتنی چند روزہ لیکن کس قدر جذبہ سے بھری ہوتی ہے۔ سارا عالم زندگی کے اُبھار اور پیدائش کی اُمنگوں سے بے آپے ہوا جاتا ہے۔ زمین خوشی سے پھولی نہیں سماتی اور اپنے جوش اور رنگینئ طبع کا اظہار اُن سرسبز پتیوں اور پودوں، اُن ننھے ننھے خوش رنگ پھولوں سے کرتی ہے۔ جو اُس کی سطح کو سرتاپا سرور کا جامہ پہنا دیتے ہیں۔

غالباً یہی وہ موسم ہے۔ جس میں دنیا کا وجود ہوا ہوگا۔ یقیناً اسی موسم میں زندگی ظہور میں آئی ہوگی۔

اور پرندوں کی آوازیں، گلہریوں کا کلکلانا، تیتریوں کا ادھر ادھر پھولوں میں مشغول ہونا کیسی عجیب کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔

لیکن یہ بہار بھی کس قدر تکلیف دہ ہوتی ہے۔ زندگی کے ابھار کے ساتھ ساتھ خواہشات کا زور اور ولولہ بھی بھڑک اٹھتا ہے۔ اُن خوابوں اور خواہشات کا جو دل کو آہستہ آہستہ مسوستی ہیں۔ جن کا میٹھا میٹھا درد دل اور دماغ حتیٰ کہ رگ رگ میں پیوست ہو جاتا ہے۔

اور اس حالت میں تنہائی کا احساس، اس بات کا کہ زندگی محبت سے خالی ہے۔ اور بھی غضب ہے۔ اس خلا کے احساس سے دل میں اس طرح ٹھیس لگتی ہے۔ جیسے کوئی باریک باریک تیز سوئیاں چبھو رہا ہو اور اپنی بیکسی کا خیال سارے جسم کو نڈھال کئے دیتا ہے . . .

لیکن مردے بھی بہار کے موسم میں اپنی قبروں سے کفن لپیٹے ہوئے نکل پڑتے ہیں۔ یاد کا دریا اُمڈا آتا ہے۔ اور وہ باتیں یاد آتی ہیں۔ جن کو انسان بھول چکا ہوتا ہے، ایسی ذرا ذرا سی باتیں جن کی ایک شخص کو روزمرّہ کی زندگی میں پرواہ بھی نہیں ہوتی، مثلاً ایسی معمولی سی بات جیسے آنکھوں کا اُٹھنا یا محض پلکوں کا جھپک جانا، یا کبھی دو ہاتھوں کا چھو جانا۔

اور اس وقت مجھ کو وہ باتیں یاد آ رہی ہیں جنکو میں قطعی بھول چکی تھی میں سمجھتی تھی۔ کہ اب میری زندگی میں اُن کا کوئی کام نہیں۔ کہ وقت کے ساتھ ساتھ وہ مجھ سے بہت دور ہو چکی ہیں، میری نظروں سے بھی اوجھل۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ میرا خیال خام تھا۔ میرے دل میں اس وقت بھی وہی کیفیت ہے۔ جو اس وقت تھی۔ جب اُس نے پہلی مرتبہ اپنی محبّت کا اظہار کیا تھا۔ میرے ہونٹ بھی جذبے سے اُسی طرح کانپ رہے ہیں جیسے اُس وقت جب اس نے پہلی بار مجھے پیار کیا تھا . . .

مگر اب مجھے ان باتوں سے کیا نسبت ؟ جب خواب ایک مرتبہ برہم ہو جاتا ہے۔ تو اُس کو کون جوڑ سکتا ہے ؟ جب بانسری ٹوٹ چکی ہوتی ہے۔ تو کون اُس سے موسیقی پیدا کر سکتا ہے ؟

تاہم اس وقت میری پچھلی زندگی خواہشات و یاد کا ایک طوفان بن کے مجھ میں سرایت کر آئی ہے۔ اور میں اُس کی موجوں کے زور کو روک نہیں سکتی۔ مجھے اس وقت کسی کی عدم موجودگی کا احساس ہے، اُس کی عدم موجودگی کا، اور اپنی زندگی مجھ کو خالی اور بے سود معلوم ہوتی ہے، بیکس اور بیکار"

(۲)

ہماری زندگی کی ندیاں جو اب تک الگ الگ بہ رہی تھیں۔ ایک رات کو یکجا ہوئیں۔ وہ ایک عجیب رات تھی۔ بہار کی رات تو نہیں لیکن

بہار کی رات سے بھی کہیں زیادہ حامل اور پُراسباب . . . .

خزاں کا موسم تھا۔ اور آخیر اکتوبر کی رات، جیسکی بڑھتی ہوئی خنکی میں دھوپ کی خوشبو بسی ہوئی تھی، اپنا جادو سارے میں پھیلائے تھی۔ چاند آسمان پر بڑی متانت اور غرور سے اپنا سر اونچا کئے تھا۔ اور افسردگی کسی کی خاموش یاد کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ خزاں اور بہار میں کتنا کم فرق ہوتا ہے۔ خزاں اپنے اندر بہار کو چھپائے رہتی ہے اور بہار میں خزاں کا وجود پوشیدہ ہوتا ہے۔ وہی درد اور گداز جو بہار کی خواہشات اور رنگ و بو میں ہوتے ہیں۔ خزاں کے موسم میں ایک یاد اور رنج بن کر پنہاں رہتے ہیں . . . .

لیکن اُس وقت جب ہم دونوں ریل میں بیٹھ گئے۔ اور گاڑی دھاڑتی چنگھاڑتی رات کی پُر فضا وادیوں میں سے ایک مست ناگ کی طرح تیز روی سے جا رہی تھی۔ تو میں سب رنجوں کو بھول گئی۔ خزاں بہار میں بدل گئی اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک نئی اور خوبصورت زندگی کا آغاز ہو رہا ہے۔

جب تک آنند میری زندگی میں نہیں آیا تھا۔ تو میں ہمیشہ افسوس اور ملال میں رہا کرتی تھی، اس کڑھن میں کہ مجھ کو کوئی نہیں پوچھتا۔ میں پہروں اپنے اوپر آنسو بہاتی کہ میں کیوں نہ حسین ہوئی۔ جو لوگ مجھے بھی پوچھتے۔ میری بہن کے بہت سے چاہنے والے تھے، لیکن میں اکیلی

تھی اور میری کوئی بھی پروا نہ کرتا تھا۔ مگر آنند نے میرے بہت سے خوابوں کو پورا کر دیا۔ اُس کی نظروں نے میری سوئی ہوئی روح کو جگایا۔ اور اُسکی توجہ کی کشش نے مجھ کو اس طرح اپنی طرف کھینچ لیا۔ جیسے مقناطیس لوہے کو کھینچ لیتا ہے۔ اور میں نے طے کر لیا۔ کہ اُس کو کبھی بھی اپنے ہاتھوں سے نہ جانے دوں گی۔

مگر اُس رات کو میں نے وہ لغزش کھائی کہ ابھی تک اپنے آپ کو نہیں سنبھال سکی ہوں۔ اور ممکن ہے کہ میں اُس کے اثر کو جو اُس نے پچھلے تین برس میں میرے اوپر قائم کر لیا ہے۔ کبھی دور نہ کر سکوں۔ کاش کہ اُس نے میری زندگی کے میدان میں قدم نہ رکھا ہوتا۔ اگر . . بس اُس سے نہ ملی ہوتی تو میری زندگی کسقدر خوشگوار ہوتی۔ لیکن جو سچ پوچھو تو اُسی نے میری تمام پوشیدہ قوتوں کو جگا کر زندگی بخشی ہے۔ آنند نے تو مجھے صرف نیند سے بیدار کیا تھا۔ لیکن اُسنے میری زندگی میں نغمہ کا جادو پھونک کر میرے مرے ہوئے دماغ کو تر و تازہ کر دیا۔ لیکن پھر میرے دل کے بیابان میں اپنی موسیقی سے آگ لگانے کے بعد وہ غائب ہو گیا۔ مگر میں محسوس کرتی ہوں۔ کہ ابھی تک شعلے اُسی طرح بھڑک رہے ہیں ابھی تک اُس کی زندگی کا نغمہ میرے کانوں میں گونج رہا ہے، ابھی تک اُس کی موجودگی میرے دماغ میں دورہ کر رہی ہے . . . .

اور اس سب کشمکش کی ابتدا اُس زمزمہ خیز رات کو ہوئی۔ جب وہ اور میں ساتھ سفر کر رہے تھے۔ اور شاید چونکہ یہ سب چلتی گاڑی میں پیش آیا۔ اس لئے میں ہمیشہ حیران و پریشان رہوں گی، اُس تیز رفتار گاڑی کی طرح . . . . .

اُس ڈبے میں ہم دونوں کے علاوہ کوئی اور نہ تھا۔ اور جب گاڑی روانہ ہو گئی تو ہم دونوں خاموش ہو کر اپنے اپنے خیالات میں محو ہو گئے۔

یہ پہلا موقع تھا۔ کہ ہم دونوں کا ساتھ تنہائی میں ہوا۔ اور باتیں شروع کرنے کے لئے میں نے اُس سے پوچھا:۔

"کیا آپ آنند کو جانتے ہیں"؟ اُس نے کہا:۔

"جی ہاں۔ وہ اور میں یونیورسٹی میں ساتھ پڑھتے تھے"!

اُس کو اس بات کا گمان بھی نہ تھا۔ کہ میری آنند سے اتنی دوستی ہے میں نے اُس کی اکثر تصانیف پڑھی تھیں۔ چنانچہ میں نے اُس سے اس بات کی فرمائش کی کہ اپنی نظمیں سُناؤ۔ وہ ذرا جھجکا۔ اور بجائے اپنی نظمیں سُنانے کے اس نے مجھ سے کہا "پہلے آپ گا کر سُنایئے"۔ میں اس اچانک فرمائش کے لئے تیار نہ تھی۔ اور ہم دونوں میں اس بات پر اصرار اور کشمکش ہونے لگی۔ کہ کون شروع کرے۔ آخر کار تھک کے ہم

دونوں خاموش ہوگئے۔ میں کھڑکی کے باہر مُنہ نکال کر چلتے ہوئے منظر اور چاند اور ٹھنڈی لطیف ہوا کا لطف اُٹھانے لگی۔ اُس نے پیچھے سے آکر مجھ سے انگریزی میں پُوچھا۔

"یہ کیا کر رہی ہو؟"

میں نے جواب دیا:۔

"میں چاند کا لطف اُٹھا رہی ہوں"

لیکن وہ بولا:۔

"نہیں آج رات کو یہ حماقتیں نہیں کر سکتیں۔ ادھر آکے بیٹھو!" اور اُس نے میری کمر میں ہاتھ ڈال کے مجھے کھڑکی سے پرے گھسیٹ لیا۔ اور گدّی پر اپنے پاس بٹھا لیا۔

میں نے محسوس کیا۔ کہ اُس میں نرمی آچلی تھی، اور جب میں نے پھر اُس سے نظمیں سُنانے کی فرمائش کی تو وہ پسیج گیا۔

بڑی دیر تک وہ مجھ کو اپنی نظمیں سُناتا رہا۔ اور میں محو ہو کر اُسکے جذبات کی تشبیر بنی کا مزہ لیتی رہی۔ پھر اُس تھوڑی دیر کی خاموشی میں جو ہم پر طاری ہو گئی تھی۔ اُس نے میرے لئے ایک نظم کہی۔ مجھے ہمیشہ افسوس رہیگا۔ کہ میں نے اُس نظم کی ایک نقل کیوں نہ لے لی۔ لیکن اُس کا مطلب یہ ہوتا تھا۔

"زندگی ایک سودا ہے پیاری۔ اس کو حاصل کر لینا کوئی آسان کام نہیں۔ اگر اس کو لینا چاہتی ہو تو اس ہاتھ دو اُس ہاتھ لو۔

زندگی ایک صحرا ہے پیاری جس میں آندھیاں بھی چلتی ہیں۔ اور کانٹے بھی اُگتے ہیں۔ اس کو بچوں کا کوئی کھیل نہ جان لینا۔

زندگی ایک تلخ شراب ہے پیاری۔ اس کو تو صرف وہی پی سکتا ہے جس کے منہ میں تلخی کا مزا بس چکا ہو۔ یہ کوئی شربت نہیں ہے۔ جس کو ہر شخص پی سکے۔

زندگی ایک طوفان ہے پیاری، جس کا لطف صرف اُن ہی کو آسکتا ہے۔ جو اس سمندر کے اندر ہیں۔ کنارے پر چلنے والے اس کو کیا جان سکتے ہیں؟

اور یہ واقعہ ہے۔ وہ لوگ جنہوں نے مصیبت نہیں اُٹھائی۔ راحت کو نہیں پہچان سکتے، جنہوں نے محبّت نہیں کی وہ نفرت بھی نہیں کر سکتے جنہوں نے حسن و عشق اور غربت و رنج کی دُشوار گذار وادیوں میں سفر نہیں کیا ہے۔ وہ زندگی کی اصلیت سے بے بہرہ ہیں ۔ ۔ ۔ ۔"

اُس کی شخصیت اور شاعرانہ اداؤں کا جادو تو چپکے ہی چپکے مجھ پر اپنا اثر کر چلا تھا۔ لیکن اس وقت یکایک میرا دل اُس کی محبت سے بھر آیا۔ بس یہی جی چاہتا تھا۔ کہ وہ ہمیشہ میرے پاس رہے۔ اور اُس کو اور اُس کی

رُوح کو جاننے کی خواہش نے ایک جذبہ کی طرح مجھ پر قابو پا لیا۔ جب اُس کے تخیل میں یہ پاکیزگی اور حُسن ہے۔ تو وہ خود کتنا حسین اور خوبصورت ہوگا۔ بس یہی خیال میرے دماغ میں سمایا ہوا تھا۔ لیکن پھر اِس خیال نے کہ یہ سب لطف صبح ہوتے جب ہم دونوں کے راستہ کٹ کر علیحدہ ہوں گے۔ ختم ہو جائیگا۔ مجھ کو افسردہ کر دیا۔

میں اپنے نئے رنج سے اس قدر بے بس ہو گئی۔ کہ اپنے جذبات کو نہ روک سکی اور بولی :-

"کیا زندگی کی دلفریب گھڑیاں ایک پھول کی زندگی کی طرح جلد ختم ہو جاتی ہیں ؟"

"ہاں۔ ایک حسین اور دل لبھانے والے تصوّر کی تیزی سے بھی جلد، کہیں جلد۔"

"اور ہمارے جذبات، ہماری سب خوشی صبح ہوتے ختم ہو جائیگی ؟"

"کون جانتا ہے۔ لیکن صبح ابھی دور ہے۔ اُس کے خیال کو پاس لانے سے فائدہ؟ اس وقت تو ہمارے اندر زندگی کی موج لہریں مار رہی ہے! اس وقت تو ہم اسکی شیرینی سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ باقی سب وہم و خیال ہے"

میں نے اپنے خیال میں محو جواب دیا :-

"لیکن یہ سب ایک خواب معلوم ہوتا ہے، اور جب صبح آنکھ کھُلے گی۔

تو کچھ بھی نہ ہوگا!"

اُس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور میرے نزدیک ہو کر بیٹھ گیا اُسکے ہاتھ کی حرارت میرے جسم میں نشہ کی طرح سرائیت کرنے لگی۔

وہ بڑی دیر تک مجھ سے حسن اور وقت اور زندگی کے لطف کی باتیں کرتا رہا۔ میں اُس کے جذبات کے اثر اور جادو سے اتنی بیخود ہو گئی۔ کہ میں بھی اُس سے اسی طرح باتیں کرتی رہی۔ جیسے ہم دونوں ہمیشہ سے ایک دوسرے سے محبّت کرتے آئے ہیں۔

وہ میری آنکھوں اور بالوں کی تعریف کرنے لگا۔ میں از حد خوش تھی اور اپنے آپ کو کھو چلی تھی۔ اُس نے میرے ہاتھ کو ذرا زور سے کھینچا۔ اور میری طرف جُھکا۔ شاید وہ مجھے پیار کرنا چاہتا تھا۔ یکایک میرے دماغ میں بجلی کی طرح یہ خیال کوند گیا کہ وہ مجھ سے کھیل رہا ہے۔ اور اس خیال کے آتے ہی میں کانپ گئی۔ فوراً میں نے اُس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اور ذرا تیزی سے بولی "شاید تمہیں کچھ غلط فہمی ہو گئی ہے!"

وہ بولا:۔

"کیسے؟ یہ کیا؟"

میں نے کہا:۔

"لیکن میں سمجھتی ہوں ضرور تمہیں کچھ دھوکا ہو گیا ہے!"

"نہیں تو کس بات کا دھوکا؟ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔"

"شاید میری باتوں سے تم نے کچھ اور مطلب نکالا"

"نہیں۔ میں نے کوئی نیا مطلب نہیں نکالا۔ آخر یکایک ایسی باتیں کیوں کرنے لگیں؟"

میں فضول کا جھگڑا مول لینا نہیں چاہتی تھی میں نے بات کاٹ کر کہا

"اب بہت دیر ہو گئی ہے۔ لیٹ جاؤ"

"لیکن مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔ اور اب تو ہرگز نہیں آ سکتی"

میرے منہ سے نکلا:۔

"نیند تو مجھے بھی نہیں آ سکتی"

"تو پھر لیٹنے سے کیا فائدہ؟"

"نہیں میرے خیال میں اچھا یہی ہے کہ اب لیٹ جاؤ"

وہ بولا:۔

"اچھا اگر تمہاری یہی خوشی ہے تو میں لیٹ جاتا ہوں"

وہ ایک گدی پر لیٹ گیا، اور میں کھڑکی کے باہر اپنا منہ نکال کر ان سب باتوں کے بارے میں سوچنے لگی۔ جو ان چند گھنٹوں میں پیش آئی تھیں۔ لیکن یہ خیال کہ وہ مجھ سے اور میرے جذبات سے محض کھیلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھ کو کھائے جاتا تھا۔

اس حالت میں مشکل سے پندرہ ہی منٹ گزرے ہونگے۔ کہ کانپور کا سٹیشن آگیا۔ ہمیں دوسری گاڑی بدلنی تھی، اور چونکہ اُس کے جلنے میں کچھ گھنٹے باقی تھے۔ ہم نے اپنا اسباب ویٹنگ روم میں رکھوا دیا۔ اُس نے بستر کھول کے بچھائے۔ اور مجھ سے بولا۔ کہ اب تھوڑی دیر کے لئے سو جاؤ۔

میں لیٹ گئی، لیکن نیند مجھ سے کوسوں دور تھی۔ آخر کار میں اُٹھ کر باہر چاندنی میں ٹہلنے لگی۔ یہ خیال کہ وہ مجھ سے کھیل رہا تھا۔ مجھے چین نہ لینے دیتا تھا۔

اُس سے نہ رہا گیا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد وہ بھی باہر نکل آیا، اور میرے ساتھ ٹہلنے لگا۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد وہ بولا:۔

"اچھا اب بتاؤ یہ تم کو کیا ہو گیا ہے؟"

میں نے کہا:۔

"مجھے تو کچھ نہیں۔ تمہیں غلط فہمی ہو گئی ہے"

اس نے پوچھا:۔

"کس بات کی غلط فہمی؟"

میں نے جواب دیا:۔

"تمہاری باتوں کے لہجہ سے ظاہر ہوتا تھا۔ کہ تم میری باتوں یا لہجہ کو غلط طریقے سے سمجھے"

وہ بولا:۔

"ہرگز نہیں۔ میں تو تمہاری باتوں کو دہرا رہا تھا۔ تم نے ہی پہلے مجھ سے اپنی نظمیں سنانے کی فرمائش کی۔ تم نے ہی پہلے اس تمام لطف اور خوشی کے ختم ہو جانے کا تذکرہ کیا"

میں بولی:۔

"لیکن اس تمام گفتگو سے میرا کوئی خاص مطلب نہ تھا۔ میں تو عام طور پر باتیں کر رہی تھی، اور اس تمام وقت میرا خیال کہیں اور تھا"

"لیکن تم سارے وقت "ہم" کا لفظ استعمال کر رہی تھیں۔ اس میں غلط فہمی کی گنجائش نہیں۔ دوسرے جب میں نے تمہارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ تو اُس وقت تم کچھ نہ بولیں۔ اور اچھا اگر تم مجھ سے "عشق بازی" بھی کر رہی تھیں۔ تو کیا ہرج ہے؟"

"کیا!" میں نے تکلیف سے چیخ کر کہا۔

"کیا ایک عورت کو "عشق بازی" کرنے کا حق حاصل نہیں ہے؟"

"عشق بازی" کا لفظ سُنکر مجھ کو حد درجہ تکلیف ہوئی۔ اب تک میں سمجھتی تھی۔ کہ شاید وہ میری کچھ پروا کرتا ہے۔ لیکن اس لفظ کو سُنکر مجھے دھکا سا لگا اور میں لڑکھڑا گئی۔

ہم عورتیں کبھی اس بات کی روادار نہیں کہ اپنے دلی جذبات کو ایک

مرد کے منہ سے اس طرح بے باکانہ دُہراتے ہوئے سنیں۔ ہم تو یہی چاہتے ہیں۔ کہ مرد ہمیشہ ہم سے میٹھی میٹھی باتیں کیا کریں اور خاموشی سے ہماری خواہشات اور مرضی کو محسوس کر کے پورا کرتے رہیں۔ لیکن جب ہمارا سابقہ کسی ایسے شخص سے پڑ جاتا ہے۔ جو ہم کو ایک ناچیز سی شے سمجھ کر دُو بدُو بات چیت کرے تو ہمارا سارا غصہ اس خواہش میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ کہ ہم اُس پر اس طرح حاوی ہو جائیں کہ وہ پھر ہم کو ناچیز نہ سمجھ سکے اور ہم اپنے تمام جادو اور سب اداؤں کو اس بات کے حاصل کرنے میں صرف کر دیتے ہیں۔

اور حالانکہ اُس وقت اُس کی گفتگو سے مجھے دلی صدمہ پہنچا لیکن پھر اُس پر قابو پا لینے کی خواہش مجھ پر حاوی آ گئی۔ اور آخر کار ہم دونوں نے صلح کر لی . . . .

(۳)

جب ہماری گاڑی کا وقت قریب آیا۔ تو صبح کے چار بجے ہم ویٹنگ روم سے نیچے اُترے۔ میں نئی چپلیں پہنے ہوئے تھی، اور کچھ تو سوچتے اور کچھ رات جاگنے سے میرا دماغ چکرا رہا تھا۔ جب ہم زینہ سے اُتر رہے تھے۔ تو ایک چکنی سیڑھی پر میرا پیر پھسلا۔ اور میں گر پڑی۔ وہ بہت پریشان ہو گیا۔ اور افسوس کے لہجہ میں مجھ سے پوچھنے لگا "چوٹ

تو نہیں آئی ؟"

جوں توں کرکے میں زینہ سے اتری چوٹ کی تکلیف بڑھ گئی تھی۔ اور میں لڑکھڑائی۔ وہ میری کمر میں اپنا ہاتھ ڈال کر مجھے دوسرے پلیٹ فارم تک لے گیا۔ جب ہم اپنی گاڑی میں بیٹھ گئے تو اُس نے مجھے لٹا دیا۔ اُس کے چہرہ سے رنج اور پشیمانی ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ کہنے لگا:۔

"مجھ کو بے حد افسوس ہے۔ کہ میری وجہ سے تم کو اتنی تکلیف پہنچی ہے۔ لیکن اب تم سو جاؤ"

"نہیں، نہیں، فضول کی باتیں مت کرو"

اُس نے مجھ سے پھر کہا۔ "اب تھوڑی دیر آرام کر لو" اور میں یہ کہکر کہ جب گنگا کا پل آئے۔ تو مجھے جگا دینا آنکھیں بند کرکے لیٹ گئی۔ . .

جب گاڑی دریا کے پل پر گذری۔ تو اُس نے مجھے ہلکے سے جگایا۔ میں پیٹ کے بل لیٹ گئی۔ اور کھڑکی کے باہر دیکھا۔ کچھ کچھ اُجالا ہو چلا تھا۔ اور آسمان پر ہلکے ہلکے رنگین اور شربتی بادل چھائے ہوئے تھے۔ دریا اپنا حسین اور پُرسکون اُجلا سینہ کھولے ہوئے فضا کی بڑھتی ہوئی روشنی کو آہستہ آہستہ اپنے اندر جذب کر رہا تھا۔ دور دور جدھر نگاہ دوڑتی تھی۔ زندگی رات کے نشہ سے چور۔ انگڑائی لے رہی تھی۔

اس وقت یکایک مجھے اپنی کمزوری کا ایسا احساس ہوا کہ میں نے

اپنی آنکھیں بند کرلیں اور دعا میں مشغول ہو گئی۔ اس وقت تک مجھے
خیال بھی نہ آیا تھا۔ کہ میں آنند کو بالکل بھلائے دے رہی ہوں۔ مگر
میں اُس میں اس قدر محو تھی۔ کہ آنند کے لئے میری زندگی میں کوئی جگہ
باقی نہ رہی تھی۔ اور حالانکہ ہماری گفتگو آنند سے شروع ہوئی تھی۔ لیکن
اُس نے آنند کو اس طرح میرے دماغ سے الگ کر دیا۔ جیسے وہ ایک وہم
وگمان تھا۔

مگر اُس وقت جب وہ میرے پہلو میں اپنا ایک ہاتھ میری کمر میں
ڈالے ہوئے بیٹھا تھا۔ تو یکایک مجھے خیال آیا۔ کہ یہ سب ایک دھوکا ہے
تھوڑی دیر کے بعد وہ الگ چلا جائیگا۔ اور میں الگ۔ اور گو میں اپنے
آپ کو کھو چکی ہونگی۔ وہ شاید پھر کبھی میرا خیال بھی نہ کریگا۔ اسوقت میں
کیا کرونگی؟ یکایک آنند کی تصویر میری آنکھوں میں پھر گئی۔ اور میں نے
اپنی آنکھیں بند کرکے اپنی مضبوطی اور آنند کی محبّت کے لئے دعا مانگی۔

شاید میں نے اس صدقدلی سے دعا مانگی تھی۔ کہ وہ قبول ہو گئی۔
لیکن اب مجھ کو اُس کے قبول ہو جانیکی کوئی خوشی نہیں۔ اُس کے بغیر
میری زندگی کتنی بے سود اور خالی ہے، امردہ اور بے آرزو۔ ۔ ۔ ۔

جب میں دعا مانگ چکی۔ تو اس کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے دیکھ رہا تھا
اُس کی آنکھوں میں وہ عجیب کیفیّت تھی۔ کہ اُس کے اثر سے میرے جسم

میں سنسنی دوڑ گئی۔ وہ کچھ دیر مجھے اُسی طرح دیکھتا رہا، اور اُس کے جذبات کی گرمی نے مجھ میں بھی ہیجان پیدا کر دیا۔ اُس وقت اُس کے دل میں بھی محبّت کی لہر دوڑ رہی تھی۔ اُس کے اندر بھی جذبات کا طوفان اُمڈا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں وہ نرمی اور نشہ تھا۔ جس کو میں ہرگز نہ بھولوں گی۔ اور ایک ہی خیال ہمارے دلوں میں پنہاں تھا۔ ایک ہی جذبہ ہمارے اندر موجزن تھا . . . .

پھر ایک ساتھ ہم دونوں نے کھڑکی کے باہر دیکھا۔ یکایک بادلوں کے پیچھے سے سورج نے اپنا سُنہری مُنہ نکالا۔ اور اُس کی رقص کرتی ہوئی کرنیں ہمارے اوپر پڑیں۔ اور ساری زمین اور فضا زندگی کی اُمنگ اور محبّت سے کِھل کھلا کر ہنسنے لگی . . . .

مگر وہ رات ختم ہو گئی۔ نہیں، ختم نہیں ہوئی۔ وہ میری زندگی کا راز بن کر میرے اندر پنہاں ہو گئی ہے۔ اُس کے تاثرات سے ابھی تک میں لطف اندوز ہو رہی ہوں۔ اس کا اور میرا ساتھ عمر بھر کا ہے اور جہاں بھی میں ہوں گی۔ جس حال میں بھی ہوں گی۔ وہ میرے سائے کی طرح میرے ساتھ رہے گی۔ نہ میں اُس رات کو بھول سکتی ہوں اور نہ اُس کو۔

خزاں اور بہار انسان کی زندگی کے ساتھ ہیں۔ خزاں بہار کی

ہراول بن کے آتی ہے۔ اور بہار خزاں سے خالی نہیں۔

اور عرصہ ہوا۔ اس نے مجھے اپنے آخری خط میں لکھا تھا:۔

"میں خزاں کے موسم میں تمہاری زندگی کی بہار میں آیا تھا، اور اب پھر خزاں کا موسم ہے۔ اور میں تمہاری زندگی کی بہار سے رُخصت ہوتا ہوں . . ." لیکن اسی طرح محبّت اور نفرت، اچھائی اور بُرائی میں جدّوجہد ہمیشہ سے چلی آئی ہے۔ اور ہمیشہ جاری رہیگی

اور حالانکہ میری زندگی خالی اور پھیکا ہے، اُس میں خزاں کا کیڑا لگ چکا ہے، لیکن بہار اُسی طرح اپنے پُورے جوش اور جشن میں ہے۔ وہی دل آویز نیلگوں آسمان ہے، وہی ولائیتی مٹر کے رنگین پھولوں کی مہک سارے میں بسی ہے . . .

محض فضول

ہمارے ماسٹر

اس بات کو برسوں گزر گئے۔ گرمیوں کی خشک، خاک آلود اور مایوس کن دوپہریں مجھے اس واقعہ کی یاد دلا دیتی ہیں۔

ہم بچے تھے، چھوٹے چھوٹے، اور چوتھی جماعت میں پڑھتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے درجہ میں بڑے لڑکے بھی تھے لیکن وہ سب آوارہ اور نکھٹو تھے۔ اور چھوٹے لڑکوں پر دھونس جماتے تھے، اُن کے بستے چھین لیتے یا ناشتہ کھا جاتے۔ ان کے گردہ میں سب نالائق بھرے ہوئے تھے۔ جن کو نہ کتابوں سے لگاؤ تھا، نہ بھلائی سے سروکار۔ لیکن اُنہیں شور مچانا خوب آتا تھا، اور وہ شرارت کر کے چپکے سے چھوٹے لڑکوں پر الزام لگا دیتے جو اپنے آپ کو بچا نہ سکتے تھے۔ اور اگر بچنے کی کوشش بھی کرتے تو اور مار کھاتے۔

اور ماسٹر زیادہ سب بھی ظالم، عیب جو، اور جنسی کجرو تھے۔ جن کو جسمانی ایذا پہنچانے میں مزا آتا تھا۔ نہ اُن میں انسانیت کی بو

تھی نہ انصاف کا احساس۔ ذرا سا موقعہ پا کر وہ مارنے کو دوڑتے۔ وہ صرف مارتے ہی نہ تھے۔ بلکہ گالیاں بھی دیتے۔ اور انھوں نے سزا کے نرالے طریقے ایجاد کر رکھے تھے۔ بنچ پر یا دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑا کرنا تو سزا میں شامل ہی نہ تھا۔ وہ ہم کو جلتی ہوئی ریت پر ننگے پاؤں دھوپ میں ہاتھ پھیلوا کے کھڑا کر دیتے۔ جیسے ہم اُن کے زر خرید غلام تھے۔ وہ ہم کو مُرغا بنوا کر پیٹھ پر بھاری پتھر رکھ دیتے؛ اور اگر وہ کہیں گر گیا۔ تو بس بیدوں سے پیٹھ نیلی اور سُوج کر کُپّا۔ گھنٹوں ہم اسی طرح کھڑے رہتے، اور کوئی ٹس سے مَس نہ کر سکتا تھا۔ ہم میں سے بہت سے اس ذلیل اور گھناؤنی سزا سے بغاوت کرتے، لیکن یہ غدر ہمارے دلوں تک محدود رہتا۔ ہم کر کچھ نہ سکتے تھے۔

ہمارے درجہ میں کوئی تیس لڑکے تھے۔ بہت سے ہر روز گاؤں سے پیدل آتے تھے۔ اور دوپہر کو جھلستی ہوئی گرمی میں میلوں واپس جاتے۔ لیکن یہ سب سے توانا اور تندرست تھے۔ کچھ کلرکوں کے بیٹے اور چھوٹے اوسط طبقہ کے لڑکے تھے۔ اُن کی مخنّس آنکھیں اُن کے لالچی اور پیلے چہروں میں چمکتی تھیں۔ یہ عام طور پہ زیادہ عمروں کے تھے۔ اور سب سے زیادہ شیطان مجھے ایک خوب

یاد ہے ۔ وہ میرے برابر بیٹھا کرتا تھا ۔ اُسے غالباً پائیریا یا کوئی اور مرض تھا ۔ اور اس کے مُنہ سے غلاظت کی کریہہ بو آتی تھی اس کا رنگ زرد تھا یرقانی ۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی روگی آنکھوں میں ، جو ہر وقت پانی سے ڈبڈبائی رہتی تھیں ، ایک عجیب قسم کی فحش کیفیت رہتی تھی ۔ اُس کی لمبی لمبی ناپاک انگلیاں جن میں بڑے بڑے بدشکل ناخن جڑے ہوئے تھے ۔ سارے وقت اُس کی جانگوں پر پھرا کرتیں ۔ وہ ہر وقت بسیچی سی رہتی تھیں ۔ اور چپ چپ کرتی ہوئی معلوم ہوتیں ۔ جب کبھی ماسٹر سزا دینے کو اُس کے ہاتھ کھلواتا ۔ تو پہلے وہ اُن کو اپنے کوٹ سے پونچھ لیا کرتا ۔ اور سزا کے بعد اُن کو زور زور سے پھونکتا ۔ اور اس طرح بھیگی بلی کی طرح معصوم صورت بنا کے بیٹھ جاتا ۔ جیسے اس نے کوئی خطا کی ہی نہیں تھی ۔ لیکن ماسٹر کی پیٹھ مڑتے ہی پھر وہی کشتم کشتہ ، پھر وہی دھینگا مُشتی ۔

ہم میں سے ایک بھڑوں سے بہت ڈرتا تھا ۔ ایک روز اپریل کے مہینہ میں ایک بھڑ چھتے کے لئے جگہ کی تلاش میں ہمارے درجہ میں گھُس آئی ، اور اُس کے ڈیسک کے قریب چکر پر چکر لگا کر دیوار سے ٹکریں کھاتی اور نیچے پھسل جاتی ۔ اُس زہریلے زرد

جانور کو دیکھ کر اُس کا دم خشک ہوا جا رہا تھا۔ وہ ڈر سے ایک طرف جھکا ہوا بھاگنے کے لئے تیار بیٹھا تھا، اور کن انکھیوں سے اُس پھیلے ہوئے کو دیکھتا جاتا تھا۔ اُس کے ساتھی نے ہنس کر اُس پہ منہ بنایا۔ فوراً ماسٹر آنکھیں نکال کر اُن کی طرف مڑا۔ لیکن نہ تو وہ یہ دیکھ سکا۔ کہ کس نے شور کیا، اور نہ وہ یہی جان سکا۔ کہ آواز کس چیز کی تھی۔ صرف اُس کو چھوٹے لڑکے کا خوفزدہ چہرہ دکھائی دیا۔ اور وہ لپک کر اُس کی طرف آیا۔ اور بے وجہ دو چار چپتیں مار دیں۔ بھڑ جو چھت سے ٹکرا رہی تھی پھر نیچے آ گئی اور لڑکے کے پاس منڈلانے لگی۔ اُس کے ساتھی نے بھڑ کو اس کی طرف گھیر دیا۔ وہ اپنی جگہ سے کود کر ایک طرف ہو گیا۔ اور لڑکے اپنے ہاتھوں سے بھڑ کو بھگانے لگا۔ ماسٹر بھاگتا ہوا اُس کی طرف آیا۔ اور سوئر، نالائق، حرامزادہ کہہ کہہ کر اسے پیٹنا شروع کیا۔ لڑکا رونے اور دھاڑنے لگا:۔

"اچھے ماسٹر صاحب اب نہیں کروں گا۔ اچھے ماسٹر صاحب اب نہیں کروں گا!"

اس پر ماسٹر نے اسے اور بھی مارا، جیسے کوئی غلام کو مارتا ہو۔ لڑکے نے سسکیاں لے لے کر بھڑ کا واقعہ سُنایا۔

لیکن ماسٹر کے ظلم کے بند ٹوٹ چکے تھے۔ اور اس نے لڑکے کی
ایک نہ سُنی۔ جب وہ پیٹ بھر کے اُسے پیٹ چکا۔ تو اپنے ڈیسک
کے پاس جا کر جوتیاں اُتار کے اپنی اونچی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اپنی
گول کالی ٹوپی اُتار کے ڈیسک پر رکھدی۔ اور چٹیا کو بڑی
آسودگی اور اطمینان سے بل دینے لگا، جیسے بلّی چوہا کھانے
کے بعد اپنا منہ چاٹتی ہے۔

اس ظالمانہ اور نامناسب سزا کے بعد گاؤں کے نو وارد
لڑکے بھی ماسٹر سے برگشتہ خاطر ہو گئے، حالانکہ وہ ہم سے فطری
طور پر نفرت کرتے تھے۔ کیونکہ ہم کو سکھایا جاتا تھا۔ کہ اُن سے
دور رہیں۔ گو ہم شہر کے بیہودہ لڑکوں کے ساتھ کھیل کود
سکتے تھے۔ لیکن یہ بھی ہم سے نفرت کرتے تھے۔ کیونکہ نہ تو اُنکے
پاس ہماری طرح اچھے کپڑے تھے۔ اور نہ قیمتی بستے اور پنسلیں۔

اس واقعہ کے بعد وہ لڑکا دو دن تک اسکول نہیں آیا۔ اُس
کا باپ تحصیلدار تھا۔ اور اُس نے ماسٹر کی شکایت ہیڈ ماسٹر
سے کی۔ لیکن جب وہ درجہ میں آیا۔ تو ماسٹر نے اُس پر آنکھیں
نکالیں اور نفرت اور غصہ سے اس کی طرف دیکھ کر طنز آمیز اور
جلے کٹے جملے کہے:-

"کیوں بے۔ بڑا تحصیلدار کا لاڈلا بنا ہے۔ ساری تیری تحصیلداری نکال دوں گا۔ اس کو مت بھولیو!"

میرے قریب ہی ایک بہت چھوٹا لڑکا بیٹھا کرتا تھا۔ اُس کا باپ سِول سرجن تھا۔ وہ درجہ میں سب سے زیادہ محنتی اور ہونہار تھا۔ وہ بہت ذرا سا تھا، کمزور اور نازک۔ اس کا کوئی قصور نہ تھا۔ اس کے برابر والے لڑکے نے اس کی دوات لوٹ دی، اور حسب معمول، ماسٹر ننھے لڑکے پر جھپٹا۔ اُس نے وجہ بتانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ ابھی ایک لفظ بھی نہ کہنے پایا تھا۔ کہ ماسٹر نے اُس کے دونوں کان پکڑ کر زمین سے اُٹھا لیا۔ پھر ایک کان چھوڑ کر اس کے منہ پر اس زور سے طمانچہ مارا۔ کہ پانچوں اُنگلیوں کے نشان بن گئے۔

"یہ اسکول ہے، نانی جی کا گھر نہیں ہے۔ ایسے ہوش ٹھکانے کروں گا۔ کہ سب ڈاکٹری رکھی رہ جائے گی!"

غریب بچہ کے کان سے خون بہنے لگا۔ ماسٹر نے اُس کو درجہ سے نکال دیا، اور معنی خیز طریقہ سے تحصیلدار کے لڑکے کو دیکھا اُس کی غصہ سے بھری سُرخ آنکھوں میں سرکشی اور مقابلہ کی دعوت تھی۔ . . . .

سب ماسٹر ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے۔ دوسرا جو ہمیں جغرافیہ پڑھاتا تھا، نوجوان تھا۔ اس وقت ہم سمجھتے تھے۔ کہ اُسکی عمر کوئی تیس سال ہو گی، لیکن وہ بائیس سے زیادہ نہ تھا۔ وہ اپنی کرسی پر اپنے بدنما ڈیسک کے پیچھے ایک خوش حال اور پیٹ بھرے شخص کی طرح اکڑ کے بیٹھتا۔ اُس کی بل دار پتلی پتلی مونچھیں تھیں جن کو وہ ہر وقت تاؤ دیا کرتا تھا۔ وہ اُن لوگوں میں سے تھا جو پولیس کی نوکری میں خوب کامیاب رہتے ہیں۔ مضبوط، ظالم، بیوقوف۔ اگر ہم پہلے ماسٹر سے کانپتے تھے۔ تو اس کی گرجتی ہوئی آواز سے سہم جاتے تھے۔ اور بید کی جگہ یہ لمبا اور موٹا رولر رکھا کرتا تھا۔ اس سے ہماری جان نکلتی تھی۔ کیسے گدگدے ننھی ننھی ہتھیلیوں پر پڑتا تھا۔ اور نیل ڈال دیتا۔ لیکن اُس کے ہاتھ خوب چلتے تھے چٹ، چٹ، چاٹ، وہ نرم نرم گالوں پر پڑتے۔ اور انگلیوں کے نشان ڈال دیتے۔ وہ آسودہ حال لوگوں اور عہدہ داروں کے لڑکوں کو کم مارتا تھا۔ لیکن بڑے لڑکوں کی گت بنانے میں اُس کی خوب خاطر جمعی ہوتی تھی۔ اور اس وجہ سے ہم اُس سے بہت خوش تھے۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی اُس کے چہرہ پر مسکراہٹ آجاتی۔ اُس وقت اُس کا چہرہ خوشگوار معلوم ہونے لگتا۔ لیکن

وہ بھی جنسی کجرو تھا جس کو جسمانی ایذا پہنچانے میں مزا آتا تھا . . .

مجھ کو خوب یاد ہے۔ مئی کی جھلستی ہوئی دوپہر تھی۔ باہر لُو کے جھکڑ چل رہے تھے۔ اور گرد اور ریت کے ڈھیر اسکول کی سلیٹی چھتوں پر ٹکراتے، اور درجوں کی کھڑکیوں سے اندر اُڑ آتے تھے۔ تفریح کے گھنٹے میں ہم کوئی سات آٹھ لڑکے املیاں توڑ توڑ کے کھا رہے تھے۔ ہمارے گروہ میں گاؤں کا ایک لڑکا، چھوٹے لال، بھی تھا۔ ہم نے دیکھا۔ کہ گو ہم شور مچا مچا کے باتیں کر رہے تھے۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ میری اُس سے دوستی تھی۔ میں نے پوچھا کیا بات ہے، لیکن وہ کچھ نہ بولا۔ اور دل نے اُس سے بات کی۔ لیکن اُس نے ایک لفظ منہ سے نہ نکالا۔ صرف وہ کھڑا کھڑا گھورا کیا۔ اور اُس کی آنکھیں باہر نکلی پڑ رہی تھیں۔ وہ کوشش کر رہا تھا، لیکن لفظ اُس کی زبان تک نہ آتے تھے۔ وہ گونگا ہو گیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر ہوئی وہ بالکل ٹھیک تھا۔ مگر اب وہ بات نہ کر سکتا تھا۔ ایک آدھ نے اُسکو چھیڑا۔ اور اس کا مذاق بنایا، لیکن وہ خاموش کھڑا سب کو وحشت بھری آنکھوں سے گھورا کیا۔ اتنے میں گھنٹہ بج گیا۔ اور ہم سب درجہ میں آگئے۔ ماسٹر اپنی کرسی پر بھدّے اور بدنما ڈیسک

کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا، اور اُس کا لمبا اور موٹا رولر اس کے سامنے رکھا تھا۔ لیکن اس کا چہرہ خوشگوار تھا۔ جب ہم اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ تو ایک آدھ مرتبہ خوف اور حیرت سے چھوٹے لال کی طرف مڑ مڑ کے دیکھا۔ لیکن وہ ساکت اور گونگا بیٹھا ہوُا پریشانی سے گھُور رہا تھا۔

ہم میں سے کسی نے ماسٹر سے کہا۔ کہ چھوٹے لال گونگا ہو گیا ماسٹر نے اُس سے پوچھا:-

"کیوں چھوٹے لال، کیا بات ہے؟"

لڑکا خوف زدہ اور پریشان، کھڑا ہو گیا، لیکن اُسنے ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا۔ ماسٹر نے دوبارہ اُس سے پوچھا، لیکن پھر وہ خاموش رہا۔ تیسری مرتبہ ڈانٹ کے ماسٹر نے کہا لیکن چھوٹے لال نے سوائے گھورنے کے اور کوئی جواب نہیں دیا۔ تب ماسٹر نے اُس کو اپنے پاس بلایا۔ اور اُسکی ہتھیلیوں پر رولر مارنے شروع کئے۔ چھوٹے لال نے اُف نہ کی۔ صرف وہ کانپتا ہوا پیچھے ہٹا۔ اور اُس کی بڑی بڑی وحشت زدہ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ ماسٹر نے پھر اُس سے پوچھا:-

"بولتا کیوں نہیں؟"

چھوٹے لال کی آنکھیں پھٹی پڑ رہی تھیں، لیکن وہ بول نہ سکتا تھا۔ رولر پھر پہلے کی نسبت زور سے پڑنے لگے۔ اُس کے سفید چہرہ پر آنسو بہ نکلے۔ اور ہر چوٹ کے ساتھ وہ سی سی کرتا اور دوہرا ہو جاتا۔ لیکن لفظ اُس کی زبان تک نہ آتے تھے۔ ماسٹر بکا، بولا، لیکن بے کار۔ غصہ ہو کر وہ اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ اور چھوٹے لال کی ہتھیلیوں پر زور زور سے مارنے لگا۔ چھوٹے لال پیچھے کھسکتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ دیوار سے جا لگا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے دُھل گیا تھا۔ اور ایک پکے ہوئے پھوڑے کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ لیکن وہ بول نہ سکتا تھا۔

آخر کار تھک کے ماسٹر نے لڑکے کو اپنی جگہ بھیج دیا، لیکن نہ تو اُس نے معافی مانگی اور نہ افسوس کی ایک جھلک اُس کے چہرہ پر نمایاں ہوئی۔ صرف اُس نے اپنا صافہ ذرا ٹیڑھا کیا اور کتاب کھول کے سبق شروع کر دیا۔

اس پورے وقت ہم سب خوف زدہ، غصہ سے کھولتے ہوئے خاموش بیٹھے رہے۔ ہمارے ساتھی کے ہاتھوں پر رولر کی ہر چوٹ ہمارے دلوں پہ شاق گزرتی تھی۔ تمام گھنٹے ہمارا دماغ سبق پڑھنے سے آزردہ تھا۔ ہماری نگاہیں چھوٹے لال

کی طرف محبت اور نرس سے اُنسیت تھیں ، اور ہمارے دلوں میں ماسٹر کی طرف سے نفرت بھری ہوئی تھی۔ اگر ہم میں ہمت ہوتی ۔ تو اُس روز ہم اُسے قتل کر سکتے تھے۔ لیکن ہم ذرا ذرا سے بچے تھے، اور طاقت کے خلاف ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے . . . .

اور اب وہ پولیس میں نوکر ہے۔

کئی سال ہوئے۔ ایک سینما میں میری اس سے ملاقات ہوئی۔ میں نے پوچھا۔ کہیئے ماسٹر صاحب اب آپ کیا کرتے ہیں، اُس نے جواب دیا "میں پولیس کا انسپکٹر ہوں"

بیمار

عزیز تولیہ لپیٹے غسل خانہ سے نکلا۔ اور آئینہ کے سامنے بال بنانے لگا۔

اگر میرے بال اور اونچے ہوتے تو ماتھا بہت خوبصورت ہوتا۔ کوئی ایسا پاؤڈر یا تیل بھی تو نہیں۔ جو بالوں کو بالکل اُڑا دے۔ اور یہ صرف پہلوؤں ہی سے اونچے ہو جائیں۔ لیکن میری بھویں تو بڑی خوبصورت ہیں۔ کس کس نے ان کی تعریف کی ہے؟ باقر۔ کھلی پیشانی گورا رنگ۔ جذبیل۔ بڑی ڈاڑھی۔ موٹی ناک۔ بسواس۔ گھنے بال چمکیلی آنکھیں۔ ہنسی مسکراہٹ۔ دو کمانوں کی طرح۔ بسواس تو کہتا تھا۔ کوہ قاف کے لوگوں کی سی لیکن وہ شاید میری تسلّی کے لئے تھا۔ میں بہت بدصورت ہوں۔ کلّوں میں گڑھے، سُوا سی ناک، انگلیوں میں کرکری ہڈی۔ لیکن بھویں تو۔ مگر صورت سے کیا ہوتا ہے۔ مرد کا حسن جسم سے ہے۔ آئینہ سے آنکھیں پھیر کر۔

یہ کلائی، باہیں، یہ طاقتور پٹھے، کیسے گول اور سڈول ہیں۔ میرا سینہ تو خوب چکلا ہے۔ گوشت تو نہیں ہے۔ لیکن خوب بھرا ہوا ہے۔ لوہے کی طرح سخت۔ انگلی بھی مُڑ جاتی ہے۔ پھر میری کمر اور ٹانگیں، لمبی اور مضبوط۔ میرے اس قد پر ہر ایک چیز موزوں ہے۔ میں حسین ہوں۔ کون مجھے بدصورت کہہ سکتا ہے؟ اور میاں مردانگی چاہیئے۔ نزاکت اور حسن عورتوں کو زیبا ہے۔ اور میں آجکل کے اُن کمزور نوجوانوں کی طرح نہیں ہوں۔ جن کو آتنک نگرہ گولیوں کی تلاش رہتی ہے۔ میں مرد ہوں مجھ میں طاقت ہے

کسی نے پیچھے سے اک نرم ہاتھ عزیز کے برہنہ شانہ پر رکھا، جس نے اُس کو اپنے خواب سے زبردستی الگ کر لیا، چٹکی لے کر، جیسے جونک پیٹ سے علیحدہ کر لی جاتی ہے۔

"ہوں! رضیہ؟ کیا ہے؟"

"کیا آپ مجھ سے بالکل خفا ہو گئے؟ وہ آپ کی محبت . . . ."

"محبت کی باتیں کرنے سے کیا ہوتا ہے؟ تمہیں معلوم ہے۔ کل میری شادی ہونیوالی ہے۔ مجھے تم سے کبھی محبت تھی ہی نہیں"

"تو کیا آپ کا التفات صرف میرے جسم سے تھا؟"

"اگر تم یہ پہلے نہ سمجھی تھیں۔ تو تمہاری بیوقوفی تھی"

عزیز چھپر کھٹ پر بیٹھ گیا ــــ کل میری شادی ہونیوالی ہے!
کل آہ کل۔ اور پھر میں اور رضیہ اور خوشی ہو گی۔ پھر میں ہوں گا
اور میرے خواب میرے پاس ہونگے۔ وہ خواب جن کو میں نے ایک
مدت سے پالا ہے۔ اور سینہ سے لگائے رکھا ہے۔ کیا کیا مصیبتیں نہ
اُٹھائی ہونگی۔ ابا جان کی مخالفت، آپا کی ناراضگی۔ ہونہہ! چاہتے تھے
کہ میں رُقیہ ہی سے شادی کروں، کیونکہ اُس سے میری منگنی بچپن
ہی سے ہو چکی تھی۔ لیکن میں جیت ہی گیا۔ اور کل میری امیدیں
بر آئیں گی، میرے خواب جن کو میں نے نازوں سے پالا ہے۔

رضیہ کھوئی ہوئی۔ مُرجھائی ہوئی، سکتہ کے عالم میں کھڑی
تھی۔

لیکن وقت کیوں نہیں کٹتا؟ ایک ایک منٹ پہاڑ ہے۔
کب کل آئے گی۔ چھپر کھٹ تو وہاں سے آگیا ہے۔ پھر یہی چھپر کھٹ
ہوگا۔ اور میری صفیہ میری ہو گی۔ اسی کمرے میں تو میں نے
اُس کو پہلے دیکھا تھا۔ اور یہی کمرہ میں نے پہلی ملاقات کے لئے
رکھا اور سجایا ہے۔

آئینہ میں اس کو اپنی صورت بہت خوبصورت معلوم ہوئی۔
لیکن کم بخت رضیہ کیوں کھڑی ہے؟ میں اس سے اسی روز

کہہ چکا ہوں کہ مجھے تم سے کبھی محبّت نہ تھی۔ ایک عجیب رونا مچایا تھا۔ نہ معلوم میرے کیوں پیچھے پڑی ہے۔ مجھے اس سے کیا رغبت ہو سکتی ہے۔

"کیا تم کو کوئی کام نہیں ہے؟ اماں جان اکیلی جہیز کے جوڑوں میں ٹانکے لگا رہی ہیں۔ آخر تم کس لئے ہو؟ کام کیوں نہیں کرتیں ابھی تک چھپر کھٹ پر پردہ بھی نہیں لگا"۔

رضیہ نے عزیز کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔ اور غم کی صورت خاموش کھڑی رہی۔ خیالات کا ہجوم اس کے دل میں اُمڈا ہوا تھا۔

"دنیا ایک دھوکا ہے، جھوٹ کا دریا ہے۔ افسوس یہ سب محبّت کچھ بھی نہ تھی۔ نفسانیت اور خواہشات۔ کیا یہ سب ظلم مجھ پر ہی ٹوٹنے تھے؟ کاش کہ میں اتنی کمزور نہ ہوتی۔ اگر میں ان کی خواہشات کو پورا نہ کرتی تو شاید۔ لیکن میں ہوں ہی کیا؟ گو مجھ میں ان ہی کا خون ہے لیکن آخر تو میں ان کے خاندان کی نہیں۔ لیکن کیا میں انسان نہیں؟ کیا میں عورت نہیں؟ کیا میں بالکل بدصورت ہوں؟ ایسی گئی گذری ہوں! تعلیم ہے تو کیا، ہوں تو لونڈیوں میں سے۔ یا تو مجھ میں وہ ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ میرا جسم نہائیت خوبصورت تھا۔ میری چھاتیاں، میرے کولھے، میری کمر، میری ہر ایک چیز خوبصورت اور لاجواب تھی۔

میری صورت، میری باتیں سب ہی بھلی تھیں۔ یا اب مجھ میں کچھ نہیں رہا۔ گو وہ بدصورت ہے۔ لیکن خاندان والی ہے۔ میں کیوں نہیں ہوں؟ کیا میری ماں انسان نہیں؟ اگر شجرہ والی ہوتی تو دنیا ہی اور ہوتی۔ خاندان سے کیا ہو جاتا ہے؟ کیا خاندان والیاں حوریں ہوتی ہیں؟ بے خصلت کی فرشتہ ہوتی ہیں؟ اگر اُس صفیہ کے باپ منصف ہیں تو میرے باپ بھی کوئی ایسے ویسے نہ تھے۔ لیکن میں لونڈی کے پیٹ سے ہوں۔ جیسے میں کوئی حیوان ہوں؟ مجھے محبت کرنے کی بھی اجازت نہیں، زندگی کا لطف اُٹھانے کا حق نہیں۔ کیا مجھ میں وہ چیزیں نہیں۔ جو خاندان والیوں میں ہوتی ہیں؟ آنکھ، ناک، صورت، شکل، دل و دماغ۔ میں لاکھوں سے اچھی ہوں۔ اُس صفیہ سے تو کہیں برتر ہوں۔ لیکن خاندان نہیں۔ خاندان . . . اُگالدان۔ تابدان۔

میں اُس کے چھپرکھٹ کا پردہ لگاؤں؟ اُس کے چھپرکھٹ کا پردہ۔ اُس کا کفن سیوں گی۔ اپنا کفن سیوں گی۔ ایسی ہی اماں جان کو خاندان کی پروا ہے۔ تو خود پردہ لگائیں۔ میرے اوپر زور چلانا خوب آتا ہے۔ چھپرکھٹ کا پردہ لگاؤ۔ جیسے میں ہی چھپرکھٹ پر سوؤں گی۔ خود کیوں نہیں لگا لیتے۔ یہ چھپرکھٹ تو میرا تھا۔ اور اب میں بیوقوف بھی

بھیڑی۔ کیا وہ سب مزے میرے حسن کے لئے تھے ؟"

وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑائی۔

"کیا کہہ رہی ہو ؟"

"کیا اب میں اتنی بری ہو گئی ؟"

"رضیہ، اس میں برائی کی کوئی بات نہیں۔ برا ماننے سے کیا فائدہ ؟"

"لیکن ایک وقت تو آپ کو مجھ سے محبت تھی ؟"

"ہاں اگر تھی بھی تو جسمانی۔ تم سے مجھ کو جسمانی محبت تھی۔ جو اب نہیں۔

"اور صفیہ سے ؟ اُس میں تو جسم بھی نہیں ؟

"لیکن صفیہ سے تو مجھ کو روحانی محبت ہے۔ محبت کو حسن کی ضرورت نہیں"

"تو کیا آپ کی روحانی محبت ایک دھوکا نہیں ہے ؟"

"ان باتوں سے کیا حاصل۔ صفیہ صرف صفیہ نہیں، وہ میرے خواب ہیں"

"مگر خواب ٹوٹ جاتے ہیں۔ آنکھ کھلنے پر حقیقت سامنے ہوتی ہے۔ کیا میرے خواب ختم نہیں ہو گئے۔ اور اب حقیقت، آہ حقیقت، رنج ہے، کاش کہ میں پیدا ہی نہ ہوتی"

"دیکھو، روؤ نہیں"

عزیز نے رضیہ کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اُسے چھپر کھٹ پر بیٹھا لیا۔

"کیوں، روتی کیوں ہو؟"

"اپنی قسمت کو روتی ہوں۔ زندگی ایک دھوکا ہے؟"

عزیز نے رضیہ کو زور سے بھینچ کر اپنے پہلو سے چمٹا لیا۔

اُس کے جسم میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔

"رضیہ کیا کروں"

"اگر آپ مجھ سے تھوڑی سی محبت کرتے رہیں۔ تو زندگی دوبھر نہ ہو"

عزیز نے رضیہ کے نازک ہونٹوں کو دیکھا۔ اور اُن کی طرف جُھکا ———

پھر وہ چھپر کھٹ جو صفیہ کے لئے مخصوص تھا، رضیہ کا تھا۔

~~~~~~~~~~~~
~~~~~~~~~~~~

اُس کے تحفے

(۱)

اس نے اپنے آنے سے چند روز پیشتر ایک پارسل بھیجا۔ وہی کچھ تحفے تحائف ——— ایک کشمیر کا بنا ہوا سگرٹوں کا بکس، کچھ ہاتھ سے سلے رومال، اور ایک اپنی تصویر۔ ایک عورت بڑی خوش اسلوبی سے پردیس میں بھی اپنی یاد تازہ کرتی رہتی ہے۔ اور اپنی آمد کے لئے اس کو تیار کرنے کا یہ بھولا لیکن شوخ طریقہ تھا۔

اس نے اپنے آنے کا کچھ نہیں لکھا تھا، صرف اتنا کہ میں آنا چاہتی تھی، لیکن نہیں آسکی۔ دونوں کا یقین مانو۔

سروپ نے پارسل کو کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کھولا۔ اُسکے دل میں ایک اُمنگ تھی۔ محبت کا جوش تو نہیں، تاہم ایک عجیب خوشی کی لہر اس کے سارے جسم میں سرایت گئی۔ غالباً اپنی اہمیت کا خیال۔ اس نے ایک ایک چیز کو مسرت اور حفاظت سے دیکھا۔ پھر وہ کاغذ کے ٹکڑے جن پر شانتا نے لکھ لکھ کر ہر چیز میں رکھ دیا تھا ———

مثلاً یہ بکس میں نے تمہارے لئے کشمیر میں خریدا تھا، یہ رومال میں نے خود تمہارے لئے بنائے ہیں، گو یہ تصویر بُری ہے، لیکن ہے تو میری! ——— بڑی احتیاط سے اُن ہی چیزوں میں کئی کئی بار پڑھنے کے بعد رکھدئے۔ اور اس کھدّر کے کپڑے کو جس میں پارسل بنایا گیا تھا تہ کر کے الگ رکھدیا۔ بکس میں فوراً سگرٹ بھرے، ایک رومال اپنی جیب میں اُڑس لیا اور تصویر کو میز پر سجادیا۔

پھر اس کا جی بھی چاہتا تھا کہ ہر شخص سے چیخ چیخ کر یہ کہے کہ دیکھو مجھے میری چاہنے والی نے یہ تحفے بھیجے ہیں، ہر ایک راہ گیر اور جاننے والے سے کہنے کو . . . .

جب آخر کار وہ کرسی میں بیٹھ گیا تو سب سے پہلے اپنے کشمیر کے بنے ہوئے سگرٹوں کے بکس میں سے ایک سگرٹ نکالکر سلگایا۔ اور نتومندی اور غرور کے انداز میں ایک بڑے آسودہ طریقہ سے دھواں اُڑانے لگا۔ اس کے چہرے پر ایک گہری مسکراہٹ قائم ہو گئی تھی۔

پھر سگرٹ کے دھوئیں میں اس کو شانتا کی تصویریں دکھائی دینے لگیں۔ کئی سال کی بات ہے کہ سروپ کی ایک دوست دہلی سے چند روز کے لئے لکھنؤ آئی تھی۔ ایک روز وہ اور اُسکی کچھ سہیلیاں سروپ کے ساتھ سینما دیکھنے گئیں۔ ان کو خیال تھا کہ سلوچنا کا فلم "نور جہاں" ہونے

والا ہے۔ جب وہ اندر بیٹھ گئے تو بجائے نور جہاں کے کرشن گایوں کے ایک غول میں کھڑا اترا اترا کے بنسی بجاتا ہوا دکھائی دیا۔ غالباً سلوچنا کا فلم مہیا نہ ہو سکا تھا اور اسکی جگہ یہ لغو تصویر دکھائی جا رہی تھی۔

وہ سب اس قدر مکدر ہو گئے کہ باہر چلے آئے۔ ٹکٹ واپس کر کے انہوں نے یہ طے کیا کہ بنارسی باغ میں چلکر پک نک منائیں۔

جاڑوں کا زمانہ تھا، اور چاند ابھی ابھی نکلا تھا۔ ہلکا سا کہر چھایا ہوا تھا اور چاند کی روشنی اس میں سے چھن چھن کر ساکت پھولوں اور درختوں پر پڑ رہی تھی۔ اس عجیب روشنی اور جاڑوں کی رات کی خاموشی میں سارا باغ پریوں کے کسی ملک کی طرح انوکھا اور دلکش معلوم ہوتا تھا۔

سب سنگِ مرمر کی بارہ دری میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس مجمع میں ایک شرمیلی لڑکی ایک کونے میں خاموش بیٹھی تھی۔ یہ شانتا تھی۔ اُسے غالباً اپنے سب سے کم عمر ہونے کا احساس تھا۔ اور چونکہ سروپ کی توجہ بھی اور طرف بٹی ہوئی تھی۔ اس نے بھی شانتا سے سوائے چند جملوں کے اور باتیں نہ کیں۔ لیکن اسکا بھولا پن اور خاموش ادائیں سروپ کو بہت بھلی معلوم ہوئیں۔

اسکے بعد اکثر سروپ نے شانتا اور اسکی بہنوں کو حضرت گنج میں ٹہلتے ہوئے دیکھا۔ لیکن وہ ان کو دور ہی سے سلام کرتا ہوا نکل جاتا اور کچھ عرصہ کے بعد ایسا ہوا کہ وہ اس کو ایک آدھ بار سلام نہ کر سکا پھر اسکے دل میں کچھ ایسی

جھجک بیٹھی کہ وہ شانتا یا اُسکی بہنوں سے کتراتا ہی رہتا۔ اور وہ ذرا سا رشتہ جو اس رات کو قائم ہو گیا تھا رفتہ رفتہ بالکل ہی ٹوٹ گیا۔

لیکن زندگی میں بہت سی باتیں اس طرح پیش آتی ہیں کہ اُن کا سبب اور راز انسان کی سمجھ سے باہر رہتا ہے، وہ اتفاقات جو دو شخصوں کو پھر یکجا کر دیتے ہیں۔

اور شانتا سے پہلی ملاقات کے کوئی چار سال بعد سروپ کا ملنا پھر اس سے ہوا۔ اور یہ ایک دوست کے گھر پہ جہاں یہ دونوں اکثر جایا کرتے تھے۔

پھر ایک مرتبہ یہ دونوں ایک اور دوست کے ہاں آگرے میں ملے اور جب ایک رات سروپ برآمدے میں پلنگ پر لیٹا بہت رات گئے نیند بلانے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن سب کے ساتھ تاج محل جانے سے انکار کر دینے پر قلق میں ڈوبا ہوا تھا، تو سب کے سب واپس آ گئے۔ وہ اپنے پلنگ پر اسطرح بنا پڑا رہا جیسے وہ گہری نیند سو رہا ہے۔ یکایک اس کو یہ احساس ہوا کہ کوئی اس کو پیار کرنا چاہتا ہے۔ اور وہ یہ جانتا تھا کہ یہ "کوئی" شانتا ہے۔ مگر چند ہی لمحوں کے بعد بغیر سروپ کو پیار کئے وہ مکان کے اندر چلی گئی . . .

لیکن اُس رات کو جب ان دونوں نے اپنا لمبا سفر ایک دوسرے کے ساتھ تنہائی میں طے کیا تو وہ ایسی بلندیوں پر پہنچ گئے جن کا دوبارہ حاصل کرنا ناممکن تھا۔

(۲)

تجھے پہنچنے کے کوئی تین ہی روز بعد شانتا خود آگئی۔ سروپ کیلئے اس کا آنا اس قدر اچانک تھا کہ وہ اس کی موجودگی میں کھوگیا، اور خوشی کے مارے پھولا نہ سماتا تھا۔

"دیکھو سروپ میں آگئی" اس نے کمرہ میں داخل ہوتے ہی کہا۔

"ارے تم بڑی پیاری ہو"

دونوں ایک ہی کرسی پر بیٹھ گئے۔ اُنکے چہرے ایک گہری خوشی اور جذبہ سے تمتما رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے کی موجودگی کے احساس میں اسقدر محو ہو گئے کہ منہ سے کوئی بات نہ نکلتی تھی۔ شانتا نے کہا۔

"ارے سروپ کچھ باتیں کرو"

"تم آگئیں اور اس سے بڑی کیا بات ہو سکتی ہے؟"

اور پھر سروپ نے شانتا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پیار کرتا رہا۔ مگر اس پر کچھ ایسی بیخودی کی کیفیت طاری ہوگئی کہ وہ چپ ہوگیا۔

"ارے کچھ باتیں کرو۔ میں ابھی پندرہ منٹ میں چلی جاؤنگی"

"تو پھر آئی ہی کیوں تھیں؟"

"تم سے ملنے۔ تم باتیں ہی نہیں کرتے"

وہ چاہتی تھی کہ سروپ اُس سے باتیں کرے۔ لیکن سروپ چاہتا

تھا کہ وہ اس طرح اُسکی موجودگی کو اپنے میں سمالے جیسے بہار کے موسم میں ایک شخص ٹھنڈی ہوا اور پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو کو ہلکے ہلکے گہرے سانس لے کر اپنے اندر اس طرح جذب کر لینا چاہتا ہے کہ وہ اس کا ایک غیر فانی جز بن جائیں۔

"کیا اس دو سال کے عرصہ میں کوئی بات بھی نہیں ہوئی جو تم مجھ سے کہہ سکو؟"

"اچھا آؤ باتیں کریں۔ لیکن کیا باتیں کریں؟ سب سے بڑی بات تو یہی ہے کہ تم میرے پاس ہو"

غالباً اب سروپ کو اُس سے کچھ کہنا ہی نہ تھا۔

جب گھنٹے نے کہیں دور آدھا بجایا تو شانتا چونک پڑی

"ارے سروپ بتاؤ تو کیا بجا ہے؟"

"ساڑھے گیارہ"

"لو میں پندرہ منٹ کیلئے آئی تھی اور اب پون گھنٹہ ہو گیا"

"ہوں۔ ابھی تو آئی تھیں، اتنی جلدی کیسے جا سکتی ہو؟ اس سے تو نہ آتیں تو اچھا ہوتا"

"لوگ میرا کھانے پر انتظار کر رہے ہونگے۔ میں تو یہ کہہ کے آئی تھی کہ گیارہ بجے تک آجاؤں گی"

وہ کھڑی ہوگئی، لیکن سروپ نے اس کا ہاتھ پکڑ کے بٹھا لیا، اور اُس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لیکر اُسکی طرف محبت اور پیار سے گھورنے لگا۔ اس کے ہونٹ جذبہ سے کانپ رہے تھے، اور اس نے شانتا کے چہرہ کو نزدیک کر لیا۔ شانتا بولی!

"سروپ تمہیں معلوم ہے جنوری میں میری شادی ہو رہی ہے؟"

ایک مرد یہی چاہتا ہے کہ ایک عورت صرف اسکی ہی ہو کر رہے۔ اور جب اُس کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کی نہیں ہے تو اس عورت اور اُسکے درمیان ایک پردہ سا حائل ہو جاتا ہے۔ اور سروپ نے اپنے ہاتھ شانتا کے چہرہ سے الگ کر لیئے، اور ذرا بن کر کہا۔

"ہاں تو کیا تحفہ لو گی؟"

جو کچھ تم دو گے۔ میں کیا بتاؤں؟ لیکن بہت عمدہ ہونا چاہیئے۔"

(۳)

جب وہ چلی گئی تو سروپ بیٹھا ہوا سوچتا رہا کہ آخر محبت کا راز کیا ہے؟ ایک شخص کسی سے محبت کرتا ہے، لیکن دوسرا اُس کیلئے اپنے دل میں کوئی خاص جگہ نہیں پاتا۔ ایک کے دل و دماغ میں تلاطم بپا ہوتا ہے؟ ساری دنیا ایک دردانگیز افسانہ معلوم ہونے لگتی ہے؟ لیکن دوسرے کا دل سرد ہوتا ہے، اس میں نہ جوش ہوتا ہے اور نہ خروش۔ آخر کیوں؟ کسی کے آجانے سے

کیوں زندگی میں ہیجان پیدا ہو جاتا ہے، اور چلے جانے سے کیوں زندگی بے سود اور بیکار معلوم ہونے لگتی ہے؟ آخر یہ اختلاف طبعی کیوں ہے؟ کیوں دونوں ایک نہیں ہو جاتے؟ اور وہ یہ شعر دہراتا رہا۔

رحمن شعلے پریم کو بُت بُت کے سُلگائیے
رحمن شعلے پریم کو سُلگ سُلگ بُت جائیے

لیکن جب اس نے اپنے دل سے یہ سوال کیا کیا میں شانتا سے محبت کرتا ہوں؟ تو اُسے معلوم ہوا کہ شانتا سے اُس کو "محبت" نہ تھی۔ جب شانتا نے اپنی شادی کا ذکر کیا تھا تو سروپ کے دل میں کوئی تلاطم بپا نہ ہوا، اور نہ اُسکو رنج ہی ہوا، اور نہ جلن۔ صرف شاید اُسکی خودنمائی کو ذرا ٹھیس لگی۔ بس۔ لیکن پھر بھی اس تذکرہ نے اس کے اندر کسی چیز کو گھونٹ کر ملیامیٹ کر دیا تھا . . . . . .

تیسرے پہر وہ پھر آئی۔

سروپ نے اپنے شبہات کا تذکرہ شانتا سے کیا۔ اس نے بھی کہا۔

"ہاں، کیوں ہے یہ نامناسبت کیوں ہوتی ہے؟"

وہ بیٹھے ہوئے باتیں کرتے رہے۔

لیکن اس وقت شانتا کی عجیب کیفیت تھی۔ ایک عجیب قسم کی عجلت اور بے چینی اُسکی ہر حرکت سے نمایاں تھی۔ کبھی وہ ادھر بیٹھتی تھی کبھی اُدھر،

کبھی کہتی تھی مجھے دیر ہو رہی ہے، کبھی کھڑی ہو جاتی، کبھی کہتی اچھا مجھے اپنا سارا گھر دکھاؤ، کبھی سروپ کے گلے میں باہیں ڈال دیتی۔

اس عجلت سے سروپ کو اور کوفت ہو رہی تھی۔ اور حالانکہ ایک مرد بعض عورتوں کے ساتھ عجلت کا برتاؤ کرتا ہے، بعض کے ساتھ وہ اطمینان اور سکون سے باتیں کرنا چاہتا ہے۔ اگر بعض کے ساتھ اس کا برتاؤ تجارانہ ہوتا ہے تو کچھ ایسی بھی ہوتی ہیں جن کے ساتھ وہ اپنے جذبات کی بھڑاس نکالنی اور سیری حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اسکے ساتھ ساتھ یہ خیال کہ ایک زمانہ میں وہ اُسکی تھی، اور یہ کہ ذرا ہی دیر میں وہ چلی جائے گی اس کو اور بھی پریشان کئے دیتا تھا۔

سروپ سمجھتا تھا کہ علیحدگی کے بعد ان کا معاملہ ختم ہو گیا تھا اور حالانکہ وہ ایک دوسرے کو خط لکھتے تھے لیکن کبھی شانتا نے اس بات کا اظہار تک نہیں کیا تھا کہ اب بھی اس کے دل میں سروپ کے لئے جذبات کی گرمی باقی ہے۔ اور اب جبکہ وہ اس سے ملنے آئی تھی تو سروپ اُسکی موجودگی ہی سے پوری طرح سیر نہیں ہوا تھا۔ وہ اس میں محو تھا، اُسکے نزدیک ہونے میں۔ لیکن وہ اس سے کچھ اور چاہتی تھی۔ کیا؟ مگر اب کیوں جبکہ وہ دوسرے کی ہو چکی تھی؟ وہ اس سے محبت کرنا چاہتا تھا، لیکن جب وہ اس کے ساتھ ہوتی تو سروپ کو اس میں کوئی خوبصورتی نہ دکھائی دیتی۔ صرف

سروپ میں ایک جذبہ بھرا ہوا تھا۔ لیکن شانتا اس جذبہ کو بیدار نہ کر سکتی تھی۔ وہ محبت کرنا چاہتا تھا لیکن شانتا سے اس کو محبت نہ تھی۔ اور محبت میں ناآہنگی سے بدتر کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی۔ کس طرح وہ دو شخص جن میں سے ایک پہاڑ پر ہو لیکن دوسرا وادی میں، یکجا ہو سکتے ہیں ؟ جب تک کہ دونوں ایک ہی بلندی پر نہ ہوں ان کا ملنا ناممکن ہے۔ سروپ کو اس وقت اُس کے جسم کی خواہش نہ تھی، بلکہ اس کے دل و دماغ، اس کی تمام ہستی کی۔ اس وقت اس کا جسم نہیں بلکہ صرف وہ خود اس کو تسکین یا اطمینان دلا سکتی تھی۔ لیکن وہ پہاڑ کی چوٹی پر تھی۔ اور یہ اس کے دامن میں۔

اُن دونوں کو غالباً ایک ہی چیز کی خواہش تھی، لیکن مختلف طریقوں سے۔ وہ چاہتی تھی کہ بس کسی طرح وہ وقت حاصل ہو جائے، لیکن سُروپ اس لمحہ کو لپک کر پکڑنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس خاص وقت سے پیشتر کے تمام لمحوں کی منزل کو پہلے طے کر لے۔ اور جب تک کہ ایک بیج پھوٹ کر پودا نہیں ہو جاتا، جب تک کہ پودے میں کلی نہیں لگتی۔ جب تک کہ کلی کھل کر پھول نہیں ہو جاتی اُسکی زندگی مکمل نہیں ہوتی۔

چلے جانے سے پیشتر اس نے سروپ سے ایک سگرٹ مانگا۔

"لو اپنے ہی بھیجے ہوئے بکس میں سے لو!" سروپ نے کہا۔

شانتا نے سوچ میں کھوئی ہوئی کیفیت میں جواب دیا۔
"تمہیں معلوم ہے سروپ میں جس چیز کو بھی دیکھتی تھی یہی جی چاہتا تھا کہ تمہارے لئے خرید لوں"۔۔۔

اور وہ سگرٹ کو ہاتھ میں لئے چند لمحوں تک اُس سے کھیلتی رہی۔ اُسکے چہرہ پر ایک مایوسی کی جھلک پھر رہی تھی، ایسی افسوس کی کیفیت جو ایک بچہ کے چہرہ پر کسی نایاب چیز کے کھو جانے پر آتی ہے۔۔۔ پھر اُس نے سروپ کی طرف نگاہ اٹھائی، لیکن کسی خیال میں غرق ہو کر پرے دیکھنے لگی۔ پھر اپنے خواب سے اچانک بیدار ہو کر بولی،۔

"اچھا میں جاتی ہوں"
سروپ نے کہا: "چلو میں تم کو پہنچا آؤں"
"نہیں تم کیا کرو گے۔ بس تم تو کمرے میں بیٹھے بیٹھے خواب ہی دیکھنا"
مگر روانہ ہوتے وقت اس نے پکار کر کہا،۔
"اسٹیشن پر ضرور مجھ سے ملنے آنا"
اب سروپ نے بھی اُسکو روکنا نہ چاہا۔ اُسکی خواہشات میں کوئی گرمی باقی نہ تھی۔
اور جب وہ اسٹیشن پر اُسے چھوڑنے گیا تو اُس نے محسوس کیا کہ شانتا کی موجودگی انجن کی اس آواز کی طرح تھی جو تھوڑی ہی دیر میں کانوں میں بس جاتی ہے۔ لیکن گاڑی روانہ ہو گئی، اور پھر وہی سناٹا تھا۔ اور کان انجن کی آواز کو ڈھونڈ رہے تھے۔۔۔!

نوروز کی رات

(۱)

نوروز کی رات تھی۔

ہوائیں بجائے سردی کے ایک خوشگواری اور شروع مارچ کی سی ٹھنڈی تھی۔

باہر چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ اور کھیتوں پر ایک کہر سا چھایا ہوا تھا، گاؤں کی جھونپڑیوں پر ہوائیں لٹکا تھا۔ اور درخت بڑی سنجیدگی سے لیکن ایک عالم شباب کی کیفیت میں کشادہ منظر پر پہرہ دے رہے تھے۔ چاندنی اُن میں سے چھن چھن کر زمین پر شیر کی کھال کی طرح بچھی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

چاروں طرف سناٹا تھا۔ سارا عالم چاند کی سبز روشنی میں خاموش تھا۔

(۲)

ایک ہفتہ سے پارٹی جمع تھی۔ رات بھر ناچ رنگ میں گزرتی۔ دن میں سب کھیتوں میں گھوما کرتے، یا رات کے لئے نئی نئی باتیں سوچتے اور اس کی تیاری میں مشغول رہتے۔

لڑکے اور لڑکیاں الگ جتھے بنائے ہوئے تھے۔ ہر جتھا یہی کوشش کرتا کہ دوسرے کو نئی سے نئی اور نرالی سے نرالی بات کرکے شکست دے۔ لڑکیاں ان باتوں میں، جیسی ان کے جنس سے توقع کی جاتی ہے۔ لڑکوں سے زیادہ چالاک تھیں۔ ذرا سے اشارے سے سب ایک جگہ جمع ہو کر کانا پھوسی کرنے لگتیں۔ لڑکے بھی اپنے کمرے میں اکھٹے ہو کر اس طرح چالیں سوچتے جیسے کسی بڑی بغاوت کے لئے سازش کر رہے ہوں۔

پھر رات کے کھانے کے بعد جو پارٹی پہلے تیار ہو جاتی بڑے کمرے میں جمع ہوتی۔ پھر سب ایک مرتبہ اور کانا پھوسی کرکے گراموفون پر ریکارڈ رکھ دیتے۔

لڑکیاں بھی اپنے کمرے کا کھٹکا کھول کر شور مچاتی ہوئی نکل آتیں۔ پھر سب قہقہے مار مار کے ہنسی مذاق کرنے لگتے۔

پھر لکڑی کے فرش پر دھب دھب شروع ہو جاتی۔ شور

کی آواز متواتر اور ایک سی ہوتی۔ بیچ بیچ میں شور اتنا زیادہ ہو جاتا
کہ بات سننی مشکل ہوتی ... ناچ شروع ہو گیا ...

اکثر رات کے کھانے سے پیشتر کھیل ہوا کرتے۔ آنکھ مچولی
اور اونچ نیچ تو معمولی باتیں تھیں۔ کبھی کبھی رسّا کشی بھی ہوتی۔
لڑکے ایک طرف اور لڑکیاں دوسری طرف۔ لڑکیوں کا جیتنا
تو مردوں کی مرضی پر منحصر تھا لیکن وہ عام طور پر جیت ہی
جاتی تھیں۔ لیکن عموماً کھیل ایسے کھیلے جاتے جن میں گانے
ہوتے ہیں۔

ریت پر دوڑنے میں اکثر لوگ گر جاتے۔ مگر کسی کو
بھی کپڑوں یا چوٹ کی پروا نہ تھی۔ دراصل مزا اسی میں
آتا تھا.....

کبھی کبھی سب ٹہلتے جاتے۔ مرد ایسی ترکیب کرتے
کہ صرف دو، ایک لڑکا اور لڑکی، ساتھ ساتھ رہتے، اور علیحدہ
علیحدہ سمتوں میں کھو جاتے۔ کوئی سڑک کی طرف چلا جاتا کوئی
تالاب کے کنارے جا بیٹھتا تو کوئی گاؤں کا چکر لگا کے آتا ....

(۳)

گاؤں میں کاشتکار رہتے تھے۔ ان سب کو حیرت تھی کہ اب کے جاگیردار صاحب کو کیا ہو گیا ہے۔ پہلے تو کوٹھی کی مرمت ہوئی جس کی حالت ابھی تک بہت خستہ تھی۔ پھر کچھ روز کے بعد ایک ایک دو دو کر کے لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے ہونے شروع ہوئے۔ صبح سے شام تک موٹروں کا تانتا بندھا رہتا۔ رات کو گیس کی روشنی ہوتی اور سارا مکان جگمگا اٹھتا۔

گاؤں والے ہر ایک چیز کو بڑے غور اور حیرت سے دیکھتے تھے۔ یہ سب کارروائی نہ صرف ان کے لئے انوکھی بات تھی بلکہ بدیشی بھی۔ انہوں نے آج تک نہ تو جاگیردار صاحب کے ہاں عورتیں دیکھی تھیں نہ یہ کرّو فر اور نہ اس قسم کی بیباکانہ آزادی۔ ایک آدھ روز تک وہ سمجھتے رہے کہ شاید کسی کی شادی ہو رہی ہے۔ لیکن نوکروں سے معلوم ہوا کہ صرف تفریحاً لوگ جمع ہوئے ہیں کہ ایک جگہ مل کر بڑے دن کی چھٹیاں گذاریں۔

جاگیردار صاحب جب سے اپنی کوٹھی میں آکر رہے تھے صبح سے شام تک صرف ایک جانگیا اور خاکی قمیض پہنے پھرا کرتے تھے۔ اکثر انہیں اپنی ڈاڑھی بنائے ہوئے ہفتوں گزر جاتے۔ لیکن اب جب بھی وہ دکھائی

دیتے تو ان کی ڈاڑھی بہت صفائی سے بنی ہوتی۔ اُن کے بالوں میں تیل پڑا ہوتا اور اُن کے کپڑے بہت ہی اعلٰی درجہ کے ہوتے۔ اکثر ان کے اپنے کاشتکار اُن کو نہیں پہچان سکتے تھے۔ اس لئے اور بھی کہ وہ شاذونادر ہی اکیلے نکلتے۔ کوئی نہ کوئی لڑکی ضرور اُنکے ساتھ ہوتی جس کی بھڑک سے لوگ اسی کو حیرت سے دیکھنے لگتے اور جاگیردار صاحب پر نگاہ دیر میں پڑتی۔ لیکن جاگیردار صاحب کو اب سلام وغیرہ کی پروا نہ تھی۔ وہ اپنی خوشی اور تنومندی میں مگن تھے۔

کاشتکاروں نے دیکھا کہ ہر روز مرغیوں پہ مرغیاں چلی آ رہی ہیں، ہر روز تیس انڈے درکار ہوتے ہیں، شہر سے گوشت آتا ہے، اور ترکاریوں کی بوچھاڑ ہے تو انہیں تعجب ہوا کہ کہیں جاگیردار صاحب کے ہاتھ کوئی خزانہ تو نہیں لگ گیا ہے۔ کیونکہ اب تک جب بھی لگان لینے کا زمانہ آتا جاگیردار صاحب اپنے غریب کاشتکاروں سے یہی رونا روتے تھے کہ اس میں مشکل ہی سے گذارہ چلتا ہے۔ دو سال کے عرصہ میں انہوں نے لگان دوناکر دیا۔ ایک مرتبہ تو یہ کہہ کر بڑھایا کہ سرکار نے لگان بڑھا دیا ہے۔ دوبارہ یہ دھمکی دی کہ اگر زیادہ دیتے ہو تو رہو نہیں تو لمبے بنو۔ ہم کو اور کاشتکار مل رہے ہیں۔ اتنی قلیل آمدنی میں ہمارا اپنا گزارہ نہیں ہوتا۔ . . .

کسانوں نے بڑی مشقت سے کھیتوں کو درست کیا تھا۔ زمین ریتیلی تھی۔ شروع میں بڑی محنت کرنی پڑی۔ اس لئے اپنی کی کرائی محنت کو رائگاں نہ جانے دینا چاہتے تھے۔ جب ایک شخص کسی زمین پر محنت کرتا ہے تو اس کو اس سے خاص لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ اس کو اپنے پسینہ سے سینچتا ہے اور اس کی زندگی اس قطعۂ زمین سے وابستہ ہو جاتی ہے۔ اس لئے بیچاروں نے زمین چھوڑنے کی نسبت زیادہ لگان دینا منظور کر لیا۔ اس میں شک نہیں کہ مہاجن سے قرض لینا پڑا۔ لیکن مرتا کیا نہ کرتا . . . . .

لیکن اب جاگیردار صاحب کے یہاں یہ سب کرّوفر دیکھ کے ان کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ وہ متحیر تھے کہ ماجرا کیا ہے۔ یہ ریل پیل اور یہ بدیشی آزادی کیسی ہے! یہ صبح سے رات تک ٹہلنا پھر شام کو کھیتوں کو روندنا اور میدان میں دوڑ دھوپ جیسے پاگل چھوٹ گئے ہوں۔ پھر رات سے لے کر صبح تک باجے کا شور، ہنسی مذاق کی آواز، مہمانوں اور جاگیردار صاحب کو کیا ہو گیا ہے! . . . . ؟

---

(۴)

کمرے کے اندر، جو رنگین کاغذ کی جھنڈیوں سے سجا ہوا تھا، گیس کی روشنی ہو رہی تھی۔ آتش دان میں آگ جل رہی تھی۔ کارنس کے اوپر خوشنما خط میں لکھا ہوا تھا۔ "1934"

کھانے کے کمرے میں بھی ایسا اہتمام اور تکلف تھا جیسے کوئی خاص اور اہم مہمان آ رہا ہو۔

ساڑھے آٹھ بجے ایک گھنٹی بجی۔ مردوں کے کمرے سے لڑکے کھانے کے کپڑے پہنے ہوئے نکلے۔ لیکن ابھی تک لڑکیوں کا کہیں پتہ نہ تھا...

لڑکوں نے شور مچایا، لکڑی کے فرش پر دھب دھب کی، پھر گریموفون پر چیختا ہوا ریکارڈ رکھ دیا...

زور زور سے ہنسی اور ٹھٹھے مارتی ہوئی لڑکیاں بھڑکیلے کپڑے پہنے ہوئے نکل آئیں۔ پھر سب کھانے کے کمرے میں داخل ہوئے اور اسطرح شور کر کر کے کھانا شروع کیا کہ کوئی بھی اٹھنے کا نام نہ لیتا تھا....

کھانے کے بعد سب گول کمرے میں آ بیٹھے۔ کمرے کے بیچ میں لکڑی کا فرش تھا اور اسکے اِدھر اُدھر کرسیاں پڑی تھیں۔ گیس کا لیمپ جھنڈیوں سے ذرا نیچے بیچ میں ٹنگا تھا۔ سامنے آتش دان میں آگ سُلگ رہی تھی۔ کارنس پر گھڑی میں ساڑھے دس بج گئے تھے۔ قہقہوں سے کمرہ گونج رہا تھا۔

کسی نے گرامو فون پر ریکارڈ رکھ دیا۔ ایک زور کے چھناکے سے باجہ بجنے لگا۔

(۵)

پسینہ پونچھتے ہوئے سب لکڑی کے فرش سے اُتر کے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کارنس پہ گھڑی میں پونے بارہ بج رہے تھے۔

کسی نے پوچھا۔

"الیاس ٹوپیاں کہاں ہیں!"

"سائڈبورڈ پر رکھی ہیں"

ایک لڑکی کی آواز آئی:

"And where are the crackers?"

"کھانے کی میز پر ہیں!"

گھڑی میں بارہ بجنے میں پانچ منٹ رہ گئے۔

سب کرسیوں سے کھڑے ہو گئے۔ کاغذ کی ٹوپیاں آگئیں، کریکرز بٹنے لگے۔ بے تابی سے سب کی نگاہیں گھڑی پر پڑ رہی تھیں۔

"بارہ بج رہے ہیں"

"There's still one minute"

سب لکڑی کے فرش پر گھیرا باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے اپنے الٹے ہاتھ سیدھی طرف اور سیدھے الٹی طرف کر لئے، اور کریکرز کے کونوں کو پکڑ لیا۔

گھڑی میں ٹھیک بارہ بج گئے۔ ایکدم سے سب نے زور لگایا کریکرز چٹ چٹ کر کے پھٹ گئے۔ ان میں سے کاغذ کی ٹوپیاں اور مبارکبادیاں نکلیں۔ سب نے ٹوپیاں اوڑھ لیں اور اسکاٹ لینڈ کے شاعر برنز کا مشہور گیت گا گا کے جانے والے سال کو رخصت کرنے لگے، اور آنیوالے سال کی مبارکبادیاں پیروں سے دھب دھب کر کے فرش پر گول گھیرے میں ناچ ناچ کر گانے لگے۔

کچھ لڑکیوں نے اپنے بھائیوں کو پیار کیا، ایک آدھ نے اور مردوں کو حسرت بھری نگاہ سے دیکھا، مردوں کی نظروں نے ان کی آنکھوں کا جواب دیا۔

پھر یکایک کمرے میں ایک ہولناک خاموشی چھاگئی۔ کارنس پر گھڑی کی آواز زور زور سے سنائی دینے لگی . . . . شام کے اُسوقت کا مایوسانہ سناٹا جب دن اور رات ملتے ہوتے ہیں۔ جب دن کی روشنی کم ہوتی جاتی ہے اور رات کی تاریکی بڑھتی آتی ہے اس خاموشی اور افسردگی کے مقابلہ میں جو سب پر طاری ہو گئی تھی بہت کم ہوتا ہے۔

تعجب کی بات ہے کہ ایسے چونچال مجمع میں یکایک اس طرح خاموشی چھا جائے جیسے وہاں ایک شخص بھی موجود نہ تھا۔ لیکن سب اپنے اپنے دلوں میں سوچ رہے تھے۔ سب کے جذبات اندر ہی اندر ان کو مسوس رہے تھے۔ یاد کا دریا اُمڈا ہوا تھا۔ وہ سب اس طرح غم کی صورت بنائے بیٹھے تھے جیسے وہ خیالات جو گذشتہ سال اُنکے تھے اب نہ رہیں گے، جیسے ایک محبوب پردیس جا رہا تھا اور اب اس کے آنے کی کوئی امید نہ تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

پوری گذشتہ زندگی کا خیال دلوں میں بھرا تھا، ان لوگوں کی یاد جو مر چکے تھے، ان ذرا ذرا سی غلطیوں کی پشیمانی جو کبھی فضول سی باتیں معلوم ہوتیں، اُن باتوں کا احساس جو سال بھر میں کی تھیں، اُن باتوں کے نہ کرنے کا افسوس جو نہ کی جا سکی تھیں۔ بس ماضی، ماضی، گذرا زمانہ، یاد کا طوفان امڈا آتا تھا۔ ۔ ۔

آسودگی میں جب فکر پاس نہ پھٹکتا ہو، جب پیٹ کی مار لوگوں کو نہ ستاتی ہو تو ایک جوابی دنیا جس کو اصلیت اور زندگی کی حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ان کو اپنے اندر پناہ دیتی ہے۔ بھوک اور پیاس، زندگی کی جدوجہد ان سے کوسوں دور، صرف خواب اُن کے ہمنوا اور ان کی حقیقت ہوتے ہیں! اور بیکاری میں

وہ اپنے رنجوں اور معمولی معمولی ذاتی باتوں کو رائی کا پہاڑ بنا لیتے ہیں، اور رنج و ملال کی اپنی ہی بنائی ہوئی وادیوں میں سرگرداں وحیران اور تخیلی تیرہ وتاریک بھول بھلیاں میں بھٹکتے پھرا کرتے ہیں۔ مگر دراصل اس شخص کی مصیبتوں کا کوئی ٹھکانا نہیں جس کی کوئی بھی مصیبت نہ ہو۔

(۶)

کشور آگ کے پاس کرسی میں بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ کرسی کے ہتھوں پر رکھے تھے۔ اس کا بے جان سا جسم آگے کو جھکا تھا۔ صرف آنکھیں ہی آنکھیں تھیں جو آگ کے اندر ٹکٹکی باندھے گھور رہی تھیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان سنہری اور سرخ لپٹوں میں، ان زرد زرد نارنجی شعلوں میں ایک ناٹک ہو رہا تھا، گزری ہوئی عمر کا تماشہ اور وہ اس میں محو تھی۔ گویا ماضی سے دوست احباب مقام اور واقعات نکل نکل کر آرہے تھے، آگ میں رقص کرتے تھے پھر غائب ہو جاتے تھے۔ . . . . . .

نریش ایک آرام کرسی میں لیٹا تھا۔ اس کے ہاتھ اس کی گود میں بے حرکت رکھے ہوئے تھے۔ وہ اسطرح خوابوں میں غرق تھا جیسے ایک قیدی کبھی کبھی خیال میں کھو جاتا ہے۔ اس کے چہرہ

سے ایسا غم عیاں تھا جو انسان اپنے لئے خود محسوس کرتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔
شمیم فرش پر بیٹھا ہوا اپنے سامنے گھور رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک لامتناہی افسوس کی کیفیت تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ ماتھے کی طرف اٹھایا۔ اسکی لمبی لمبی انگلیاں اس کے بالوں میں کھو گئیں۔ پھر اس نے اپنے ماتھے کے بالوں کو انگلی پر لپیٹ لیا اور زور زور سے کھینچنے لگا جیسے وہ کسی اذیت دینے والے خیال کو دور کرنے کے لئے اپنے آپ کو تکلیف دے رہا تھا ۔ ۔ ۔ ۔
سب کے سب آسودگی سے شکم پُر یاس و حسرت کے سمندر میں ڈوبے ہوئے تھے، حتیٰ کہ شاہد بھی جو ہر وقت ہنستا بولتا رہتا تھا اب اس ذاتی دلسوز طوفان کا شکار ہو کر اس میں غوطے کھا رہا تھا۔
لیکن وہ اس وقت کو بھی نہ بھولے تھے کہ اور لوگ تعجب کر رہے ہوں گے کہ یہ غیر معمولی اور عجیب خاموشی کیسی ہے ۔ سب کو کیا ہو گیا ہے ۔ گو وہ اپنے اپنے خیالات میں محو تھے ۔ لیکن ان کو ایک دوسرے کی موجودگی کا احساس تھا جو انسان کو تنہا محسوس کرنے سے روکتی ہے، اس بات کا احساس پیدا کر دیتی ہے کہ خواب اور تنہائی بری اور اخلاق اور تہذیب

سے گری ہوئی چیزیں ہیں۔اسی لئے یہ خاموشی اور افسردگی کی حالت چار پانچ منٹ سے زیادہ دیر تک قائم نہ رہی حالانکہ اتنے ہی عرصہ میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ صدیاں گذر گئی ہوں گی۔

اس ذاتی تنقید اور دوسروں کے خیال اور تہذیب کے ڈر نے اُن کو اس خودکشی کے طوفان سے بچا لیا اور فاخرہ نے اپنے جنس کے چھپا دینے والے اس احساس سے جو ہر عورت کو اپنے جذبات کے ظاہر کرنے سے روک دیتا ہے، گریموفون پر ریکارڈ رکھ دیا.....

باجے کی آواز سے سب اپنے اپنے خوابوں سے بیدار ہو گئے. یہ معلوم ہوا کہ ایک بیجان چیز میں جان پڑ گئی اور اس میں حرکت آ گئی۔ سب نے اپنے اپنے دماغوں سے خواب غفلت کا پردہ اٹھا دیا اور گفتگو کی ہلکی ہلکی آواز آنے لگی۔اور سب ہنسنے بولنے لگے۔.....

---

(۷)

ایک ایک کر کے مرد اپنے کمرے میں چلے گئے۔

انیس نے پلنگ کے نیچے سے بوتلیں اٹھا اٹھا کے میز پر رکھیں۔
ایک کاک کے کھلنے کی آواز پیدا ہوئی۔ جھاگ بوتل میں سے اُبلنے لگے۔
جلدی جلدی گلاس آگے بڑھے۔ ایک اور بوتل کھلی اور سب کے گلاس
لبریز تھے۔ نریش مرجھایا ہوا بیزار ایک طرف کھڑا تھا۔
"ارے نریش کیا ہو گیا ہے؟" انیس نے اُسکے شانے پر زور سے
مار کے کہا۔ گم ایلونگ۔ شریک ہو۔ یہ کیا ہوا —— " اور اس نے
اپنے بڑے بڑے ہونٹ ٹیڑھے کر لئے، آنکھیں اور بھویں اوپر چڑھا لیں
اور افسوس کا ایسا خاکہ کھینچا کہ سب کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

نریش سب کے برابر اپنی بے رخی پر قابو پا کے کھڑا ہو گیا۔ لیکن
پھر اُن پر خاموشی سی چھا گئی۔ انیس کے پر جوش جملوں کو سب بھول گئے۔
انکی آواز رات کے سناٹے میں، باجے کی دھیمی دھیمی آوازیں کھو چکی تھی۔ ایسا
معلوم ہوتا تھا کہ وہ آواز کبھی اور کہیں اور سے آئی تھی اور اب اسکا پتہ تک نہ تھا۔
پھر سب کے ہاتھ آگے بڑھے، گلاسوں کے ٹکرانے کے چھناکے ہوئے۔
آنکھوں میں تیزی آئی اور وہ ایک دوسرے کے جام صحت پینے لگے۔

"Here's to you"

"And to you"

"And to you" انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر گلاسوں کو اونچا اٹھا اٹھا کے کہا۔

"Here's to those who are away from us" انیس نے خاموشی اور افسردگی سے کہا۔

"Here's to the new year" ظہیر اپنے گلاس کو ہوا میں نچا کے بولا۔

"Here's to our host for the wonderful time he has given us" شاہد نے کہا اور سب نے 'چیرز' کہہ کہہ کے گلاس منہ کو لگائے۔ اور پھر سب زور زور سے گانے لگے: "For he is a jolly good fellow"

اس تمام وقت شمیم کا ہاتھ ایک مشین کی طرح خود بخود اٹھتا اور اس کے ہونٹ آپ ہی آپ کھلتے اور بند ہوتے تھے۔ جب سب نے گلاسوں کو منہ سے لگایا تو اس نے ان کو کسی حد تک حقارت سے دیکھا۔ پھر اُسکے ہونٹ کسی جذبہ سے کانپنے لگے۔ اُسکے چہرہ پر ایک درد کی سی کیفیت عیاں ہوگئی اور اس نے ایسے لہجہ سے جس میں انسان کی خودغرضی کے لئے نفرت جھلکتی ہوئی دکھائی دیتی تھی کہا۔

"نسیم مرحوم کو کسی نے بھی یاد نہ کیا۔ کیا لوگ ایک عزیز دوست کو اتنی جلدی بھول جاتے ہیں؟" اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور اس کے جوان چہرہ پر جھریاں پڑی ہوئی دکھائی دینے لگیں۔

یہ معلوم ہوا کہ ان جملوں سے گویا سب پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

انیس نے اس غفلت پر پشیمانی سے بات بنانی چاہی۔

"نہیں نسیم کی یاد ہمارے دلوں میں تازہ ہے"

اوروں نے بھی اپنی ندامت اور شرمندگی کو چھپانے کے لئے ہوں ہاں کی۔ پھر سب بڑی دیر تک سر ڈالے ہوئے اس طرح کھڑے رہے جیسے بچے شرارت پر ڈانٹ کھانے کے بعد سرنگوں ہو کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور گویا اپنی غلطی کی تلافی کرنے کے لئے سب نسیم مرحوم کی یاد میں مبتلا ہو گئے۔ . . .

پھر ایک ایک کر کے سب بڑے کمرے میں جانے لگے اور ناچ رنگ شروع ہو گیا۔

ظہیر فرخ کے ساتھ ناچنے لگا۔ نریش کشور اور فاخرہ کو اپنے دونوں پہلوؤں میں لئے ٹھٹھے مارتا ہوا ناچ کے فرش پر دھب دھب کر رہا تھا۔ ظہیر کو کسی کی آنکھیں دیکھ کر آنکھیں یاد آ رہی تھیں اور وہ خیال میں غرق بیٹھا تھا۔ پھر مایا نے یہ کہہ کر "آئیے میرے

ساتھ ناچیئے،، اس کو اپنے تخیل سے الگ کر لیا۔

شمیم نے ناچنے والوں کو تیزی سے گھورا۔ اب اس کو اپنا ماضی ایک دردانگیز افسانہ کی طرح معلوم ہو رہا تھا" سب ناچ رہے ہیں۔ پیر، اور ان میں جذبات ہیں۔ میرے ماضی کا ناچ لوگوں کے پیروں میں ہے۔ سب میرے ماضی کو کچل رہے ہیں۔ کیوں کسی کو اوروں کی پروا نہیں ہوتی؟ میرے جذبات کا ان کو کیا علم؟ سب ناچ رہے ہیں۔ بس میں ان سب کو دیکھے جاؤں مت دیکھ۔ . . . کس قدر خود غرض دنیا ہے۔ ایک کو بھی پروا نہیں۔ عورتیں چاہئیں اور سب خوش ہیں۔ کسی کو مرحوم کی یاد نہیں۔ کیا اتنی جلدی سب بھول سکتے ہیں؟ ایک تو سدھار گیا، اور سب ناچ رہے ہیں . . . ."

عظیم اپنی کرسی پر سوچ میں بیٹھا تھا۔ ظہیر اس کے برابر آکے بیٹھ گیا اور بولا،

"بھئی ناچتے کیوں نہیں؟"

عظیم نے جواب دیا،

"جاؤ بھی مزے کرو میاں۔ اس افسردگی سے کیا حاصل؟" مگر عظیم نے جواب دیا،

"ہاں۔ لیکن ان فضولیات سے بھی کچھ فائدہ نہیں۔ دنیا میں رنج اور مصیبت کے علاوہ کیا دھرا ہے! میری حالت تو کچھ اب اُن فرانسیسی پادریوں کی سی ہو گئی ہے جو دنیا کی حماقتوں، ناپائیداری اور ناانصافی سے بیزار ہو کر اپنے آپ کو اس دنیا سے علیحدہ کر چکے تھے، اور اس پر اپنے غصّہ اور نفرت کا اظہار نوتر ادم کی گرجا پر شیطان کے بت بنا بنا کے کرتے تھے۔ صرف میں ان سے دماغی حالت میں بہتر ہوں۔ کیونکہ میں ان سب کی حماقتوں کو بھی خوب جانتا ہوں"

پھر وہ اپنی کرسی سے اٹھا اور باہر چلا گیا۔ چاند کے دُھندلے اُجالے میں گاؤں پر غربت اور افسردگی کا گہرا چھایا ہوا معلوم ہوتا تھا اس کی جھونپڑیاں اندھیری پڑی تھیں۔ اور سارے میں خاموشی کا دور دورہ تھا۔ وہ آہستہ آہستہ گاؤں کی طرف چلا۔ اس کے خیالات بے ثباتی دنیا اور زندگی کی ناپائیداری سے بھرے تھے۔ اس کیفیت میں ریتیلی زمین پر چلنا جہاں قدم بوجھ سے آہستہ آہستہ اُٹھتے تھے۔ بھلا معلوم ہوتا تھا۔ ایک گیدڑ اس کا راستہ کاٹ کے بھاگا۔ درخت پر ایک اُلّو کے بولنے کی آواز آئی . . . . جب وہ ایک پیپل کے درخت کے نیچے گزرا تو یکایک اس کی نگاہ اٹھی۔ سامنے سڑک، دھندلی اور سفید، گاؤں میں چلی گئی تھی۔ اس کے داہنے ہاتھ کو ایک

کنواں تھا، جس کی چرخی کی بلیاں اس مدھم روشنی میں پھانسی کی طرح دکھائی دیتی تھیں۔ اور کنویں کا تاریک منہ اس گڈھے کی طرح معلوم ہوتا تھا جس میں لاش پھانسی کے بعد ڈال دی جاتی ہے۔ اس خیال کے آتے ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ماتا دین اور اس کی بیوی اور بچوں کی خودکشی کا نقشہ پھر گیا جو اسکے میزبان نے اس کو سنایا تھا۔ ۔ ۔

ماتا دین ایک محنتی اور ہونہار کسان تھا۔ موجودہ جاگیردار کے والد کے زمانہ میں اس نے اچھے دن بھی دیکھے تھے۔ لیکن جب سے ان کا انتقال ہوا اور ان کے بیٹے نے کام سنبھالا تو ماتا دین کے عیش و آرام کے دن بھی ختم ہو گئے۔ کچھ تو لگان بڑھنے اور کچھ سوکھا، پڑنے سے اس کی آمدنی بالکل ختم ہو گئی۔ جانوروں میں وبا پھیلی اور اس کی بہترین گائے اور دونوں بیل مر گئے۔ لیکن اس نے مہاجن سے قرض لے کر پھر زندگی از سر نو شروع کی۔ مگر وہ اس قابل نہ ہوا کہ مہاجن کا قرضہ اُتار سکے۔ اور سود ہر سال دونا اور چوگنا ہوتا رہا۔ گاؤں میں ہیضہ پھیلا اور اس کا لڑکا جو اب ۱۷ برس کا تھا اور کھیتی باڑی میں باپ کا ہاتھ بٹاتا تھا ہیضہ سے مر گیا۔ اسی عرصہ میں جاگیردار صاحب نے دوبارہ لگان بڑھانے کی ٹھانی۔ ماتادین

نے ابھی تک بالکل ہمت نہ ہاری تھی۔ پچھلے سال اس نے کچھ قرضہ لے کر اچھے بیج بوئے۔ اب اُسکی آنکھیں اپنی نئی فصل پر گڑی ہوئی تھیں۔ لیکن اس سال ایسا پالا پڑا کہ اس کی ساری فصل بیکار ہو گئی۔ مہاجن نے قرضہ کا دعوے کر دیا۔ جاگیردار صاحب نے نکل جانے کی دھمکی دی۔ اب ماتا دین کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔ دیوتاؤں کو بھینٹ چڑھائی۔ شاہ صاحب کی قبر پر منت مانی۔ لیکن کوئی تدبیر نہ چلی۔ فاقے پہ فاقے گزرنے لگے۔ اس سب جھنجھٹ سے نجات پانے کی صورت نہ دکھائی دیتی تھی بھیک مانگے نہ ملتی۔ اس سے مر جانا بہتر تھا۔

ایک روز اس نے مہاجن سے دس روپے برابر کے سود پر قرض لئے۔ مٹھائی منگائی، رات کو سارے گاؤں کی دعوت کی۔ سب سمجھے کہ شاید اس کے دن پھر گئے۔ لیکن جب مہمان واپس چلے گئے تو ماتا دین اور اس کی بیوی نے اپنے بہترین کپڑے پہنے اور اپنے تینوں بچوں کو بھی پہنائے۔ پھر سب خاموشی سے اُس کنویں پہ آئے۔ پیپل کے نیچے پوجا کی۔ اپنے بچوں کو سمجھایا کہ چونکہ دنیا میں بھوک اور مصیبت کے علاوہ کچھ نہیں دھرا ہے اس لئے بیکنٹھ کو چلا جانا بہتر ہے۔ بچے بھی خوشی خوشی اس بات

پر راضی ہو گئے۔ اور سب سے پہلے ماتا دین پھر اس کی بیوی پھر ایک ایک کرکے دو بچے کنویں میں کود ے۔ لیکن تیسرا جو سب سے چھوٹا تھا ڈر کے مارے نہ کود سکا۔ جب صبح ہوئی تو گاؤں والوں نے اس کو کنویں پر روتا ہوا پایا۔ . . . .

اب عظیم کا ڈر نفرت سے بدل گیا تھا۔ اس نے مڑ کر مکان کی طرف دیکھا۔ روشندان اور کھڑکیاں روشنی سے جگمگا رہی تھیں۔ ہوا کے ایک جھونکے کے ساتھ باجے کی دھیمی دھیمی آواز آئی، اور پھر سناٹا چھا گیا۔

"کیا خود غرض دنیا ہے۔ سب کو اپنی اپنی پڑی ہے۔ دولت، مرغن کھانے، عیش۔ یہ دنیا کی حقیقت کو کیا جان سکتے ہیں؟ غریب سے انھیں کیا لگاؤ۔ وہ تو مرنے ہی کے لئے ہوتا ہے۔ روشنی، جشن، جھنڈیاں، شراب، عورتیں۔ جیسے کوئی بڑا گڈھ جیت لیا ہے۔ ناچ ہے اور اس میں سارے جہاں کا لطف اور مزا۔ دو اور دو چار ٹانگیں، اور چکنے فرش پر تھرک تھرک کر مٹک مٹک کر چل رہی ہیں۔ ناچ میں راحت ہے۔ لیکن کیا اس میں شکست کا احساس نہیں ہے، زندگی کی اصلیت سے منہ موڑ لینے کا، حقیقت سے ڈر کر عیش و عشرت میں اس کو بھلا دینے کا؟

لیکن سب خودی کے نشہ میں چور، دنیا کی حقیقت سے بے بہرہ، مگن، ناچ رہے ہیں . . . . . .''

اور ناچ اور شور و غل قائم رہا۔ ۴۳ء ختم ہو چکا تھا۔ ۴۴ء کا آغاز تھا۔ اندر یہ تماشا تھا، باہر گاؤں پہ بے بسی اور مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ اس جشن اور خود پرستی اور اُس غربت اور افسردگی کے اختلاف پر شرما کے چاند اپنا منہ آموں کے پیچھے چھپا رہا تھا۔ ایک کتا کہیں دور بھونکا۔ ایک مرغ اپنی نیند سے بیدار ہو کر بانگ دینے لگا۔ لیکن پھر سارا منظر چاند کی ڈوبتی ہوئی روشنی میں خاموش ہو گیا۔ اور ساری فضا عالم سکوت میں کھوئی ہوئی آرام اور رات کے نشہ سے مست اس طرح سوئی پڑی رہی جیسے کوئی حسن کی دیوی خوابوں کی نیند میں ہوا کی دُلائی اوڑھے ہوئے عشق کے مزے لے رہی ہو۔

دور تک کھیتوں پہ کہر سا چھایا ہوا تھا، اور درخت ایک عالم شباب کی کیفیت میں کشادہ منظر پر پہرہ دے رہے تھے۔

غلامی

ہرے ہرے کھیتوں میں سے بہتی ہوئی نہر کے کنارے بیٹھکر دونوں دوستوں نے اپنے ساتھ کی چاء پی۔ پھر نہر کے ٹھنڈے پانی سے منہ ہاتھ دھوکر گھاس پر پاؤں پھیلا کے بیٹھ گئے۔ دُور دُور جدھر نگاہ دوڑتی تھی کھیت لہلہا رہے تھے۔ ہوا اُن میں سے تیزی سے ہوتی ہوئی سائیں سائیں کرتی نکل جاتی تھی، اور گیہوں کی بالیاں خوشی اور جذبہ سے اپنے سر دُھنتے لگتی تھیں۔ صاف شفاف نیلے آسمان پر ایک آدھ بادل کا ٹکڑا امید کی طرح چمک رہا تھا۔ ہر چیز میں ایک رومانی کیفیت تھی، اور زمین سے بشاشت کا نغمہ پھوٹ رہا تھا۔ ایک دوست نے کہا۔

یہاں سے تو اٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ یہی جی چاہتا ہے۔ کہ فضا کا جزو بنکر یہیں رہ جاؤں" دوسرا بولا،

وہاں بہت نایاب جگہ ہے۔ لیکن ایک طرف یہ قدرت

کے کرشمے اور دلفریبی، اور دوسری طرف وہ غربت اور گندگی جس میں بیچارے کاشتکاروں کی زندگیاں گذرتی ہیں؟

"غالباً اُن بیچاروں کو دس روپیہ ماہانہ بھی مشکل سے پڑتے ہونگے۔ گذر کیسے کرتے ہیں؟"

"مہاجن سے قرض لیتے ہیں۔ ایک مرتبہ ہم لوگ دیہات میں گئے تھے۔ وہاں بہت سے کاشتکاروں سے بات چیت کی۔ سب کے سب قرضہ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ بے ایمان بے ٹھکانے سود لیتے ہیں۔ ایک تو لگان دینا پڑتا ہے، دوسرے سستا زمانہ ہے۔ مشکل سے ان کو پانچ یا چھ روپیہ مہینہ کا اوسط پڑتا ہے کاشت کی آمدنی کا زیادہ حصہ تو لگان میں چلا جاتا ہے۔ کچھ دودھ گھی سے کما لیتے ہیں۔ لیکن میاں کتنا کما سکتے ہیں؟ بس کسی نہ کسی طرح پیٹ بھر لیتے ہیں۔ ادھر دوسرے ملکوں کے کسان ہیں۔ ولایت میں کسانوں کے گھر جاکر آنکھیں کھلتی ہیں۔ کیسی صفائی اور سلیقہ ہوتا ہے۔ وہاں تو ہم ہمیشہ چھٹی کے دن دیہات میں چلے جاتے تھے۔ کسی کاشتکار کے ہاں جاکے چاء پی لی۔ اتنی لاجواب ہوتی تھی کہ کچھ ٹھکانا نہیں۔"

"اور ہمارے ہاں چاء تو درکنار، بیچاروں کو سوکھی روٹی بھی

مشکل سے میسر آتی ہے۔ دوسری طرف ہم لوگ ہیں چین کی بنسی بجاتے ہیں۔ دنیا میں کتنی ناانصافی ہے۔۔۔۔ "

جب وہ نہر کے کنارے سے اٹھے تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ آسمان پر شفق نے رنگ بکھیر دئے تھے، اور اس کے رنگین عکس نہر کے پانی میں نہایت دلکش معلوم ہوتے تھے۔ دونوں نے آخری مرتبہ چاروں طرف نگاہ اٹھا کے دیکھا، اور پھر سڑک کی طرف روانہ ہو گئے۔

جب وہ اپنی موٹر میں بیٹھ کے چلنے والے ہی تھے تو سامنے سے ایک گنوار عورت آتی دکھائی دی۔ اس کی عمر کوئی پچاس سال ہوگی۔ اس کے چہرہ پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں، اور وہ ایک بڈھی گائے کی طرح دبلی اور سوکھی تھی۔ دوستوں میں سے ایک نے اس سے بات کرنی چاہی اور بولا:

"کیا تم اسی گاؤں میں رہتی ہو؟"

وہ رک گئی اور اس طرح دیکھنے لگی جیسے اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ جب اس سے یہی سوال دوبارہ کیا گیا تو بولی:-

"ناہیں۔ ہم دوسر گاؤں میں رہت ہیں"

"اب کی پیداوار کیسی ہے"

وہ سہم گئی اور اس طرح گھورنے لگی جیسے کوئی اس کا گلا گھونٹ رہا ہو۔ اس کے چہرہ کی ہڈیاں اور اُبھر آئیں۔ وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑائی اور خاموش کھڑی رہی۔

کچھ کوّے کائیں کائیں کر کے نزدیک کوڑے کے ڈھیر پر ایک دوسرے سے لڑنے لگے۔ ایک سیاہ کتا جس کی سخت اور سفید کھال کھجلی کی وجہ سے کریہہ منظر معلوم ہوتی تھی اپنے بڑے بڑے دانتوں سے اپنے پُٹھے کو چباتا ہوا گذرا۔

اس عورت کے چہرہ پر ایک قسم کی بھیانک افسردگی عیاں ہونے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے، اور وہ ذرا خوف زدہ سی ہو کر بولی:

"ہم تو ہار بات سمجھت ناہیں"

"میرا مطلب ہے اب کی فصل کیسی ہوتی ہے۔ اچھی ہے نا؟"

وہ بالکل حقیر اور ناچیز معلوم ہوتی تھی۔ اس کے چہرہ پر صرف کھال اور ہڈیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ اپنی میلی ساڑھی میں وہ ایک ایسے مُردے کی طرح معلوم ہوتی تھی

جو کفن پہنے ہوئے قبر میں سے کھڑا ہو گیا ہو۔ کچھ دیر پریشانی سے گھور کر وہ بولی:

"بہت کھراب جی۔ بہت کھراب"

اور یہ کہتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر اس طرح رونے لگی جیسے اُسے اپنی حالت پر خود رنج ہو رہا ہو۔

"ہائے بیچاری عورت" اس نے زور سے اپنے آپ سے کہا، اور پھر اپنے دوست سے بولا:-

"معلوم ہوتا ہے بیچاری بیمار یا مصیبت زدہ ہے" اور وہ اپنی پتلون کی جیب میں سے اس کو دینے کے لئے کچھ پیسے نکالنے لگا۔ اس کا دوست جو اب تک خاموشی سے یہ سب باتیں دیکھ رہا تھا اس سے انگریزی میں کہنے لگا:-

"نہیں جی۔ کیوں فضول دیتے ہو۔ بیمار ویمار نہیں ہے۔ یہ تو ان کی عادت ہے۔ یہ لوگ اتنے عرصہ سے بادشاہوں اور زمینداروں کے ظلم اٹھاتے چلے آئے ہیں کہ کبھی سچ نہیں بتاتے وہ سمجھتے ہیں کہ اگر یہ کہہ دیا کہ کاشت اچھی ہوئی ہے تو زمیندار ان سے زیادہ وصول کر لیں گے۔ ان غریبوں کو دھوکا بھی بہت دیا گیا ہے"

"ہاں، یہ ٹھیک کہہ رہے ہو۔ غلامی ان کی رگ رگ میں بس گئی ہے۔ اس کے اثر کو دور کرنے میں بھی عرصہ لگے گا۔ لیکن اس بیچاری عورت پر بڑا ترس آ رہا ہے "

"نہیں میاں۔ اب بہت دیر ہو رہی ہے۔ چلو"

اور یہ کہہ کر اس نے موٹر چلا دی۔ اس کے دوست نے آہ بھری اور پیچھے مڑ کر دیکھا وہ عورت ابھی تک کھڑی ہوئی اپنی ساڑھی کے دامن سے اپنے آنسو پونچھ رہی تھی۔ پھر یکایک موٹر کی گرد نے اس کو گھیر لیا اور وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔

موٹر لاری کا سفر

میں کلب میں بیٹھا ہوا ایک صاحب کے ساتھ معمّے حل کر رہا تھا کہ میرے دوست یکایک آ نکلے۔

"ارے رحیم۔ تم کب آئے؟"

انہوں نے جواب دیا،

"تیسرے پہر"

ہمیں ایک دوسرے سے ضروری باتیں کرنی تھیں، اور ہم دونوں کمرے کے ایک خالی کونے میں جا بیٹھے۔ میں نے کچھ پینے کو منگایا، لیکن میرے دوست نے انکار کر دیا۔ میں بولا:

"میں بیمار تھا۔ کل ہی اُٹھا ہوں"

"ہاں، ہاں، پیو، اس سے تم کو یقینی فائدہ ہوگا"

جب میں پی چکا تو ہم گھر کی طرف چلے۔ میں نے اُن سے اُن باتوں کا تذکرہ کیا جو ان سے آخری بار ملنے کے بعد پیش آئی تھیں،

مثلاً میرا بمبئی اور لکھنؤ کا سفر اور اس کی وجوہ ، وغیرہ وغیرہ اُدھر وہ بھی بے صبری سے ایک اسکول کے حالات مجھ کو بتا رہے تھے جس میں وہ ایک امتیازی حیثیت رکھتے تھے ، کیا کیا نئی صورتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ اور اس کی سیاسیات نے کیا کیا پلٹے کھائے تھے۔ . . . .

ہوا میں کافی ٹھنڈک تھی ، اور سڑک پر بہت کم لوگ چل رہے تھے۔ ابھی روشنیاں بھی نہیں جلی تھیں ، کیونکہ تین یا چار تاریخ کا چاند آسمان پر چمک رہا تھا۔ اور ٹھیک اس کے اوپر کی طرف مڑے ہوئے گول کنارے پر ایک چاند کی مانند چمکدار ستارہ جگمگا رہا تھا ، اور دو چار اور تارے اِدھر اُدھر ٹِم ٹِم کر رہے تھے ، جیسے وہ آسمان پر جڑے ہوئے ہوں۔ گول تار کی سڑک دُھندلی اور تاریک دور تک سامنے چلی گئی تھی۔ ایک آدھ بھٹکا بھولا کتّا ہمارے سامنے سے راستہ کاٹ کر گزرا۔ اور دو آدمی سائیکلوں پر جاتے ہوئے ملے۔ اس سب منظر کو میں نے ایک ہی نگاہ میں اس وقت بھانپ لیا جب میں بکا یک لڑکھڑا کر اپنے دوست کی سائیکل کو سہارے کے لئے پکڑنے کو جھک رہا تھا۔ یہ غالباً اُس شراب کا اثر تھا۔

"تو سمجھے۔ اس لئے وہ مضمون بہت ضروری ہے۔"

"ارے ہاں۔ وہ مضمون۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ میں ابھی تک اس کو پورا نہیں کرسکا مجھے بخار آرہا تھا۔ اسی روز جب تم آخری مرتبہ یہاں آئے تھے۔ میری طبیعت کچھ کچھ خراب تھی اور اگلے روز سے تو میں بس پڑ ہی گیا۔ ابھی اس کو ختم کرلیں گے۔"

"اس کو ذاتی اور تعصبی رنگ دینا ضروری ہے۔ تم جانتے ہو کہ امام خاں کے نام سے جائیگا۔ وہ بے ایمان انسپکٹر کے پاس گیا تھا تاکہ اس کو اپنی طرف کرلے، اور انسپکٹر بڑا متعصب اور بد معاش ہے تم اس کا بھی تذکرہ کردینا۔"

"اچھی بات ہے۔ اس پر بھی غور کریں گے۔"

"یہ سب اس ہیڈ ماسٹر کی بد معاشی ہے۔ در اصل اُسکے تمام حقوق چھین لئے گئے تھے، کیونکہ اس پر غبن کا شبہ تھا۔ اور جب اس معاملہ میں کارروائی کی گئی تو وہ پاگل بن کے پاگلخانہ میں داخل ہوگیا۔ اور اس میں چھ مہینہ تک رہا۔"

"لیکن اس کو تو برخاست کردینا چاہیئے تھا۔ تعجب ہے، وہ ابھی تک نوکری پر بحال ہے اُس کو نکال کیوں نہیں دیتے ہو۔"

"بہت جلد ہی اس کا بھی بندوبست ہوجائیگا۔ حال ہی میں ایک

میٹنگ ہونے والی ہے۔ لیکن جب وہ پاگل خانہ سے نکلا تو پریزیڈنٹ کے پیروں پر گر پڑا اور بہت رو یا اور گڑ گڑایا۔ اسی لئے وہ نکالا نہیں گیا۔

اس عرصہ میں ہم مکان تک پہنچ گئے۔ میں نے اس مضمون کے مسودہ کو نکالا اور اخبار میں سے کٹے ہوئے ایک مضمون کو، اور فوراً ہی کام میں مشغول ہو گیا تاکہ جتنی جلدی ممکن ہو اس بوجھ سے نجات پاؤں۔

"دیکھو دیباچہ ہی میں اس کو تعصبی رنگ دینا" اور یہ کہہ کر وہ ایک اخبار کے ورق پلٹنے لگا۔ میں نے کہا،

"یہ کہانی پڑھو جو میں نے حال ہی میں لکھی ہے" اور اسکی طرف کچھ ٹائپ کئے ہوئے کاغذ بڑھا دیئے۔ لیکن کچھ سوچ کر میں نے کہا،

"اچھا، نہیں، میں خود ہی پڑھ کر سناؤں گا"

میں نے چند سطریں لکھیں اور اس کو پڑھ کر سنائیں۔

بخدمت ایڈیٹر صاحب . . . . .

جناب من،

آپ کے ۵ ۲ ستمبر کے پرچہ میں ایک نامہ نگار کا مضمون اردو مدارس کے بارہ میں چھپا تھا۔ ۲۰ ستمبر کو اپنے شذرات میں جناب نے اُس مضمون کو بہت "باخبر" اور قابلانہ بتایا تھا۔ میں کسی

"تو سمجھے۔ اس لئے وہ مضمون بہت ضروری ہے۔"

"ارے ہاں۔ وہ مضمون۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ میں ابھی تک اس کو پورا نہیں کر سکا مجھے بخار آ رہا تھا۔ اسی روز جب تم آخری مرتبہ یہاں آئے تھے۔ میری طبیعت کچھ کچھ خراب تھی اور اگلے روز سے تو میں بس پڑ ہی گیا۔ ابھی اس کو ختم کر لیں گے۔"

"اس کو ذاتی اور تعصبی رنگ دینا ضروری ہے۔ تم جانتے ہو کہ امام خاں کے نام سے جائیگا۔ وہ بے ایمان انسپکٹر کے پاس گیا تھا تاکہ اس کو اپنی طرف کر لے، اور انسپکٹر بڑا متعصب اور بد معاش ہے۔ تم اس کا بھی تذکرہ کر دینا۔"

"اچھی بات ہے۔ اس پر بھی غور کریں گے۔"

"یہ سب اس ہیڈ ماسٹر کی بد معاشی ہے۔ در اصل اُسکے تمام حقوق چھین لئے گئے تھے، کیونکہ اس پر غبن کا شبہ تھا۔ اور جب اس معاملہ میں کارروائی کی گئی تو وہ پاگل بن کے پاگلخانہ میں داخل ہو گیا۔ اور اُس میں چھ مہینہ تک رہا۔"

"لیکن اس کو تو برخاست کر دینا چاہیئے تھا۔ تعجب ہے، وہ ابھی تک نوکری پر بحال ہے اُس کو نکال کیوں نہیں دیتے ہو۔"

"بہت جلدی اس کا بھی بندوبست ہو جائیگا۔ حال ہی میں ایک

میٹنگ ہونے والی ہے۔ لیکن جب وہ پاگل خانہ سے نکلا تو پریزیڈنٹ کے پیروں پر گر پڑا اور بہت رویا اور گڑگڑایا۔ اسی لئے وہ نکالا نہیں گیا۔

اس عرصہ میں ہم مکان تک پہنچ گئے۔ میں نے اس مضمون کے مسودہ کو نکالا اور اخبار میں سے کٹے ہوئے ایک مضمون کو، اور فوراً ہی کام میں مشغول ہو گیا تاکہ جتنی جلدی ممکن ہو اس بوجھ سے نجات پاؤں۔

"دیکھو دیباچہ ہی میں اس کو تعصبی رنگ دینا" اور یہ کہہ کر وہ ایک اخبار کے ورق پلٹنے لگا۔ میں نے کہا:۔

"یہ کہانی پڑھو جو میں نے حال ہی میں لکھی ہے" اور اسکی طرف کچھ ٹائپ کئے ہوئے کاغذ بڑھا دیئے۔ لیکن کچھ سوچ کر میں نے کہا، "اچھا، نہیں، میں خود ہی پڑھ کر سناؤں گا"

میں نے چند سطریں لکھیں اور اس کو پڑھ کر سنائیں:۔

بخدمت ایڈیٹر صاحب . . . .

جناب من،

آپ کے ۲۵ ستمبر کے پرچہ میں ایک نامہ نگار کا مضمون اردو مدارس کے بارہ میں چھپا تھا۔ ۲۸ ستمبر کو اپنے شذرات میں جناب نے اس مضمون کو بہت "باخبر" اور قابلانہ بتایا تھا۔ میں کسی

مباحثہ میں پڑنا نہیں چاہتا، لیکن مجھے بہت افسوس کیساتھ
کہنا پڑتا ہے کہ یہ واقعات کے قطعی خلاف ہے میں ایک
ایسے مدرسہ کے بارہ میں کچھ واقعات پیش کرتا ہوں جس سے
مجھ کو بخوبی واقفیت ہے، جو اس بات کا صاف صاف اظہار
کر دیں گے کہ آیا وہ مضمون "باخبر" ہے یا نہیں۔ ورنہ واقعات
کو توڑ مروڑ کر کیتھرائن میو کا سا مقصد نہ آسانی .... "

"کیتھرائن میو کا سا مقصد کیا ہوتا ہے؟"

میں نے ایک لمحہ سوچ کر جواب دیا:

"ایک بے بات کی بات کو اس نیت سے اتنا بڑھا دینا کہ ..... "

"اوہو، کہیں تمہارا مطلب اس کیتھرائن میو سے تو نہیں ہے جس
نے "مدر انڈیا" لکھی ہے؟"

"بالکل! میرا مطلب اُن ہی مقاصد سے ہے جو "مدر انڈیا" میں
پائے جاتے ہیں۔"

"ہاں، ہاں، میں سمجھ گیا۔"

میں نے کسی نہ کسی طرح وہ مضمون ختم کر لیا، اور اپنے دوست کو پڑھکر
سنایا۔ اپنے کندھوں پر سے اس بار کے ہٹ جانے سے میں بہت ہی ہلکا
ہو گیا تھا۔ اور گفتگو بدلنے کیلئے، کیونکہ وہ حضرت ابھی تک اس کمبخت

مدرسہ کے بارہ میں کچھ اور باتیں کیئے جاتے تھے، میں نے کہا:
"اچھا، رحیم، اب میری کہانی سنو، مجھے ڈر ہے کہ یہ تم کو شاید ناپسند ہو گی، کیونکہ یہ بالکل غیر متعصب ہے، اور اسکے اشخاص بھی ــ بس ــ میرا مطلب ہے دونوں جنسوں کے ہیں۔ اور غالباً اسکے واقعات بالکل ہی تمہاری پسند کے خلاف ہوں۔ لیکن یہ زندگی سے لی گئی ہے۔"

یہ کہانی ایک مسلمان عورت اور ایک ہندو مرد کے عشق کی داستان تھی، جس پر اتفاق نے پانی پھیر دیا تھا۔ خیر، میں نے کہانی پڑھنی شروع کی، اور وہ بہت ہی بے پروائی سے سنتا رہا، اور کبھی کبھی جمائیاں لیتا تھا۔ لیکن جب شروع کے دو چار واقعات، جو صرف عورت ہی کی زندگی سے تعلق رکھتے تھے جبکہ وہ اپنے عاشق سے ملی بھی نہیں تھی، ختم ہو گئے، تو میرے دوست، ایک مسلمان عورت کے ہندو عاشق کا نام سن کر، یکایک بولے:

"تمہیں تو اس واقعہ کو الٹ دینا چاہتے تھا۔"

ہاں، یہی تو بات تھی جو میں ڈرتا تھا تم کو ناپسند ہو گی۔ لیکن، پوری کہانی کا مصالحہ زندگی سے لیا گیا ہے۔ یہ واقعات میرے علم میں پیش آئے ہیں، دراصل یہ میرے ہی دوستوں پر گذرے ہیں لیکن ذرا کہانی کے اختتام تک صبر کرو۔"

"مگر تمہیں ان لوگوں کے نام بتانے ہوں گے؟" اس نے کہا، لیکن میں نے جواب دیا،

"اُوں ہوں! یہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن میں ایک اور کہانی لکھوں گا، اور عجیب بات یہ ہے کہ وہ بھی بالکل سچی ہے، جس میں، اتفاق سے، ایک ہندو عورت ہے، اور ایک مسلمان مرد۔" وہ بولے،

"یہ بڑا ہی اچھا رہیگا۔ اور جب تک کہ تم اس کہانی کو نہ لکھ لو اس کو مت چھپوانا۔ بغیر اُسکے یہ ادھوری ہی رہے گی۔ یہ واقعات اس وقت پیش آئے ہونگے جب تم دہلی میں تھے؟"

"شاید۔ لیکن مجھے کہانی ختم کر لینے دو۔"

میں پڑھتا رہا اور اس نے مجھ کو ایک آدھ بار یہ کہنے کیلئے ٹوکا کہ میں نے تشبیہیں بہت ہی عمدہ استعمال کی ہیں، یا یہ کہنے کیلئے کہ میں نے ذرا ذرا سی باتوں کو خوب یاد رکھا ہے۔ جب میں کہانی ختم کر چکا تو تھوڑی دیر کیلئے باہر چلا گیا۔ جب میں کمرہ میں واپس آیا تو رحیم صوفے پر سے کھڑا ہو گیا۔ اور ایک شرمیلی، جھینپی ہوئی سی مسکراہٹ سے بولا،

"بھئی کچھ ایسے واقعات سناؤ جو تم کو اپنی زندگی میں پیش آئے ہیں۔"

"یہ تمہیں کیسے خیال آیا؟"

"تمہاری کہانی سُنکر۔"

"اچھا! مگر پہلے تم کچھ آپ بیتی سناؤ، اور اگر ممکن ہوا تو میں بھی اپنی سناؤنگا" کچھ دیر غور کرنے کے بعد وہ بولا ،

"چند روز ہوئے ایک عجیب دلچسپ ماجرا پیش آیا۔ ارے یار! ہر ایک چیز، سوائے آخری کارروائی کے"

"او ہو، بڑا دلچسپ ہو گا۔ سناؤ، یار"

قریب سے ایک گھنٹے نے دس بجائے ؛ اور رحیم نے کہا، "چونکہ اب دیر ہو گئی ہے، میں تمہارے ہی ہاں سوؤنگا۔ میں نے اسکے لئے بیٹھنے کے کمرہ میں ایک پلنگ ڈلوا دیا، اور اس کے خیال دلانے سے اس کی سائیکل بھی اوپر منگوالی۔ اب وہ بہت ہی مطمئن ہو گیا، اور میں اس کا قصہ سننے کے لئے برابر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"یہ واقعہ صرف کوئی دس روز ہوئے پیش آیا۔ ابھی تک میں نے صرف نصیر کو سنایا ہے۔ یا شاید، میں نے تم کو بھی تو سنایا تھا؛ ذرا ٹھہرو۔ میرا خیال ہے میں نے تم کو سنایا تھا"

"نہیں تم نے مجھ کو نہیں سنایا"

"غالباً میں نے امام خاں کو سنایا ہو گا"

اور جب اس نے شروع کیا تو اسکے گورے چہرے پر ایک خوشی کی مسکراہٹ پھر رہی تھی، اور مجھے اسکی نیلگوں آنکھوں میں شرارت

کی پتلی رقص کرتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ اُسکے چہرہ پر ایک قسم کی خودنمائی عیاں تھی۔ جو ایک انسان اسوقت محسوس کرتا ہے۔ جب اس نے کوئی بڑا اور اہم کام بڑی خوش اسلوبی سے پورا کر لیا ہو۔

"میں مکان سے آرہا تھا۔ غالباً دس تاریخ تھی" اور وہ غور میں اپنا سر سہلانے لگا۔ لیکن میں نے کہا:

"خیر دس تاریخ ہوگی"

"ہاں، کوئی دس تاریخ کو میں موٹر لاری پر آرہا تھا کہ گھر سے کوئی دو میل پرے ہم کو سڑک پر ایک اینگلو انڈین مرد اور لڑکی کھڑے ہوئے دکھائی دیئے" اور یہ کہہ کر اس نے زور سے ٹھٹھا مارا جس میں خوشی اور خودنمائی دونوں شامل تھے "لاری کھچا کھچ بھری ہوئی تھی لیکن اُن دونوں کو شہر آنا ضرور ہی تھا۔ ڈرائیور نے اُن سے کہا کہ مطلق جگہ نہیں ہے لیکن وہ مرد بولا کہ "اگر مس صاحب کو کسی طرح سے آگے بٹھالو تو بڑا ہی اچھا ہوگا، میں تو کسی نہ کسی طرح گزارا کر ہی لونگا" میں ڈرائیور کے برابر آگے بیٹھا ہوا تھا۔ تم جانتے ہو مجھے سب ڈرائیور جانتے ہیں۔ اور پھر وہ آدمی خود میرے پاس آیا اور اس عورت کے آگے بیٹھنے کی اجازت مانگی، اور کہا میں تو کسی نہ کسی طرح بیٹھ ہی جاؤنگا" اور میاں، اندھا کیا چاہیے دو آنکھیں، میں اور اس سے زیادہ کیا چاہ سکتا تھا؟"

اور اس نے ایک اور بہت ہی مطمئن ہنسی کا قہقہہ لگایا۔ دراصل، اس ساری گفتگو کے دوران میں اس کے چہرہ کی کھال گویا اس مسکراہٹ سے تڑخی جاتی تھی جو برابر اس کے چہرہ پر پھر رہی تھی۔

"بڑی خوشی سے" میں نے کہا۔" اور اس نے یہ قریب قریب بالکل وجد کی سی کیفیت میں کہا" وہ آکر میرے اور ڈرائیور کے بیچ میں بیٹھ گئی۔ تم جانتے ہو وہاں بہت ہی کم جگہ ہوتی ہے۔ اور آدمی ہمارے پیچھے اندر جا کے بیٹھ گیا۔ وہ ایک . . . . ایک . . . ." اور یہ کہتے کہتے وہ اپنی کرسی میں پیچھے کو مڑا، اور اپنے ہاتھ سے اس طرح ٹٹولنے لگا جیسے وہ اس کو کسی ٹھوس چیز پر پھیر رہا تھا، اور ایک موزوں لفظ کی تلاش میں اٹکنے لگا۔

"تختہ" میں نے کہا۔

"ہاں! تختہ۔ بس تختہ کے پیچھے۔ وہ لڑکی بہت حسین نہ تھی لیکن اچھی خاصی تھی، جوان، اور جوبن پر۔ میرا مطلب ہے وہ کسی طرح بھی بُری نہ تھی، بلکہ بہت ہی خوب اور دلفریب۔ میں تو یار، خاصہ لٹو ہو گیا، اور چونکہ وہ بالکل ہی میرے نزدیک بیٹھی تھی، مجھ میں ایک لہر سی دوڑ گئی۔ افسوس تو یہ ہے کہ کمبخت سفر صرف ۱۴ میل کا تھا، نہیں تو بڑا

مزا آتا۔ ہمیں مفت میں ایک لونڈیا مل جاتی، اور تم اور میں —— تم جانتے ہو۔۔۔" اور اس نے یہ اپنے ہاتھ ہوا میں اِدھر اُدھر مٹکا کر کہا۔
اس نے اپنی کرسی ذرا گھبراہٹ سے میرے اور نزدیک کھینچ لی، اور میری آنکھوں میں کسی قدر جوش اور پریشانی سے گھورنے لگا، اور اسکے روشن چہرہ کی مسکراہٹ اور اسکی آنکھوں کی چمک اور بھی روشن ہوگئی۔
"سنائے جاؤ، رحیم۔ بڑے ہی خوش قسمت ہو، یار۔ ہاں تو پھر کیا ہوا؟"
"خیر، تو چونکہ لڑکی میرے بالکل ہی نزدیک بیٹھی ہوئی تھی، میں نے اپنے دل میں کہا، یارو کچھ کرنا چاہیئے۔ اس کے اور میرے درمیان بہت ہی کم جگہ تھی، تم جانتے ہو، وہ میرے اور ڈرائیور کے بیچ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی ٹانگ بالکل میری ٹانگ کے پاس تھی، اور میں نے اپنا پیر اٹھایا۔۔۔"
"اور اس کے پیر کو دبایا؟"
"ہاں، قریب قریب۔ میں نے اپنی ٹانگ اس کی ٹانگ کے اور بھی نزدیک کر لی۔ اور اب میری ٹانگ اسکی ٹانگ کے اتنی قریب ہوگئی کہ وہ بالکل اس کو چھو رہی تھی۔ میں نے اپنی ٹانگ اُسی جگہ رہنے دی، اور اس نے کچھ بُرا نہ مانا۔ میری ہمت بڑھی میں نے اب اپنی ٹانگ اُسکی ٹانگ کے اتنے پاس کر لی کہ وہ ایک دوسرے سے

بالکل ہل گئیں۔ اس نے اس پر بھی کچھ بُرا نہ مانا۔ اور میں نے اپنے دل میں
کہا، یہاں تک تو معاملہ بالکل ٹھیک ہے، اب اور کوشش کرنی چاہیئے
میں نے اپنی ٹانگ کچھ دیر تک اسی جگہ رہنے دی۔ میرا ہاتھ ران پر
رکھا ہوا تھا، اور میں نے اس کو تھوڑا سا اس کی طرف بڑھایا۔ میں نے
اس کو اسی طرح سے تھوڑی دیر تک پڑا رہنے دیا، اور پھر اس کو ذرا سا
اور آگے بڑھایا۔ حتیٰ کہ وہ اس کی ران کو چھُونے لگا۔ اور اس نے اس
پر بھی کچھ بُرا نہ مانا۔ اس کا ہاتھ اُسکی ران پر رکھا ہوا تھا، اس طرح —"

اور اس نے اپنی کرسی میرے اور بھی نزدیک کھینچ لی، اور میرا
ہاتھ لے کر اپنی ایک ٹانگ پر رکھ لیا، اور اپنا ہاتھ اپنی دوسری ٹانگ
پر، اور وہ واقعی اتنے نزدیک تھے کہ انگلی کو ذرا سی جنبش دینے سے
وہ میرے ہاتھ کو چھو سکتا تھا۔

"اور میں نے آہستہ سے اپنی انگلی یہ دیکھنے کیلئے اُس کی ران
پر پھیری کہ وہ کیا کرتی ہے، بس کوئی ایک ہی سیکنڈ کے لئے گویا
اتفاق سے وہ اس کے لگ گئی تھی۔ لیکن وہ ہلی تک نہیں۔ پھر میں
نے اپنا ہیٹ اُتار کے اپنے ہاتھ کے اوپر اپنی ٹانگ پر رکھ لیا، اور پھر
ذرا دیر کے بعد میں نے اُس کو اُس کی ٹانگ کی طرف سرکا دیا، اور
اب میں نے اپنا ہاتھ اپنی ہیٹ کے نیچے سے اس کی ران پر سرکا لیا۔

تم جانتے ہو، تمام ڈرائیور مجھکو جانتے ہیں، اور پھر وہ حرامزادہ ہمارے پیچھے ہی بیٹھا ہوا تھا۔ کاش کہ وہ کمبخت نہ ہوتا۔"

اب اس قصہ میں مجھ کو کافی دلچسپی ہوگئی تھی، لیکن میری دلچسپی زیادہ تر نفسیاتی تھی، اور میں اس کے چہرے کو بڑے غور اور دقیقہ سنجی سے دیکھ رہا تھا، جس میں سے اب جھینپ اور گھبراہٹ کے تمام آثار غائب ہوچکے تھے۔ صرف اس کی آنکھیں اور بھی زیادہ چمک رہی تھیں، اور مسکراہٹ اسکے چہرہ پر سکون اور استقلال سے قائم ہوگئی تھی۔ اور میں نے کہا،

"ہاں، تو پھر کیا ہوا؟"

"خیر، تو میں نے اپنی ہیٹ کو اپنی ٹانگوں پر رکھا رہنے دیا، اور اپنے ہاتھ کو ذرا اور آگے بڑھا دیا۔ اب وہ اس کی ران پر رکھا ہوا تھا، اور میں نے اس کو تھوڑی دیر تک وہیں رہنے دیا۔ جب اس نے اس پر بھی کچھ نہ کہا تو میں نے اپنے ہاتھ کو ذرا اور آگے سرکایا، اور اب وہ اس کے ہاتھ کو چھونے لگا۔ کچھ دیر کے بعد میں نے اپنی انگلیاں اُسکے ہاتھ پر رکھدیں، لیکن اس نے اس پر بھی بُرا نہ مانا اور نہ اپنا ہاتھ ہی ہٹایا۔ اور تم جانتے ہو اگر وہ شریف لڑکی ہوتی تو اس بات کو قطعی پسند نہ کرتی۔ لیکن اس نے ذرا بھی بُرا نہ مانا۔"

"غالباً وہ اس دھوکے میں رہی کہ تم ہندوستانی نہیں ہو۔ کیونکہ تم غیر معمولی طریقہ پر گورے ہو، تمہاری آنکھیں نیلی ہیں، اور تمہارے بال اور وضع قطع بالکل ہندوستانیوں کی سی نہیں ہے۔ ہر کوئی تمکو ایک بدیشی تصور کرے گا۔"

"ہاں، یقینی" اس نے کہا، اور اس کی خود نمائی کا جذبہ ذرا جوش پر ہو گیا۔" پادری صاحب بھی، جو انگریز ہیں، یہ ہی کہتے تھے، تم ہندوستانی کس طرح ہو؟ بڑے تعجب کی بات ہے کہ تم ہندوستانی قطعی نہیں معلوم ہوتے، وہ ایک مرتبہ کہتے تھے۔ اور تم جانتے ہو، میں ہیٹ اور سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ . . . . خیر، تو میں نے اپنا ہاتھ اُسکے ہاتھ پر تھوڑی دیر تک رکھا رہنے دیا۔"

"لیکن، کیا تم نے اس کو غور سے دیکھا تک نہیں۔ میرا مطلب ہے، کیا تم نے اس کے چہرہ کو نہیں دیکھا؟"

"ہاں، ہاں، وہ بہت جھینپی جھینپی اور گھبرائی ہوئی معلوم ہوتی تھی، جیسے وہ کانٹوں پر بیٹھی ہو۔ اور یقینی، تم جانتے ہو، وہ جذبہ سے بھری ہوئی تھی۔ اس تمام وقت میرا ہاتھ اسکی ران پر رکھا ہوا تھا۔ اسکی جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو گھبرا جاتا۔ اور رانیں بہت ہی نازک چیزیں ہوتی ہیں۔ ان میں حس کا مادہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔"

"ہاں، بالکل. گویا وہ عورت کی کشش کا مرکز ہوتی ہیں"
وہ زور زور سے خوشی سے ہنسنے لگا، اور میں بھی ہنسنے میں اُس کے ساتھ شریک ہو گیا۔ غالباً اس لئے اور بھی کہ میں نے خاصی قابلانہ بات کہی تھی۔

"لیکن، یار، ہم اس وقت کمبخت. جمنا کے پل پر پہنچ گئے تھے، جو موٹروں کے اڈے سے صرف کوئی دو میل ہے۔ لیکن اب میں بہت دلیر ہو گیا، اور میں نے اس کی انگلیاں اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ وہ کچھ نہ بولی، اور میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، اور یار اس نے میرے ہاتھ کو بھینچا۔ اور ہم اسی طرح ہاتھ میں ہاتھ ڈالے بیٹھے رہے"

"بھئی تم بڑے بیوقوف ہو. سارا وقت یہ ہی معلوم کرنے میں ضایع کر دیا کہ وہ بُرا مانیگی یا نہیں، یا اب کیا کرے گی۔ ارے یار وہ تو تیار تھی، تمہیں تو کسی طرح چوکنا نہیں چاہیئے تھا"

اُس کے چہرہ سے مسکراہٹ غائب ہو گئی، اور اُسکی آنکھوں میں ایک قسم کی سوگوار کیفیت آگئی۔ یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اُس کے جذبۂ خود نمائی کو ٹھیس لگی ہے، اور اس کا منہ اس طرح لٹک گیا جیسے وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ بہت گدھا ہے۔

"ہاں، میں نے فضول اس قدر احتیاط برتی۔ واقعی میں نے سارا وقت اپنا ارادہ ہی پختہ کرنے میں ضائع کر دیا، صرف اسی سوچ بچار میں کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ میں واقعی بہت گدھا تھا۔ اور اب ایسا موقع شاید ہی آئے۔ اگر ایک مرتبہ موقع کو ہاتھ سے نکل جانے دو تو بس وہ پھر کبھی نہیں آتا۔"

"لیکن تم نے اُس سے بات چیت کیوں نہیں کی؟"

"مگر وہ حرامزادہ جو پیچھے بیٹھا ہوا تھا، اور سارے ڈرائیور مجھ کو جانتے ہیں۔ میں نے اس سے البتہ یہ ضرور پوچھا تھا کہ کہاں جا رہی ہو، اور اس نے مجھے چپکے سے بتایا۔"

"تم نے اس کا نام تک نہیں پوچھا؟"

"لیکن، یار، وہ آدمی جو پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔"

"تو کیا ہوا۔ تم اُس آدمی ہی سے باتیں کرتے، اور اُن کے بارہ میں سب کچھ معلوم کر لیتے، وہ کہاں رہتے ہیں، کیا کرتے ہیں۔"

"میں نے اُس آدمی سے تو باتیں کی تھیں۔ اس نے مجھ کو اپنا نام بھی بتایا تھا۔ یسمنڈز یا سولومن تھا، مجھے یاد نہیں آتا۔ وہ یہ کہتا تھا کہ وہ اس کی بہن ہے، اور وہ اُس کو دیوالی، نہیں، نہیں، دسہرہ، کی چھٹیوں کے بعد اسکول پہنچانے جا رہا تھا۔ ارے یار،

اگر میری اس سے پھر کسی طرح ملاقات ہو جائے، تو اس سے دوستی کر لینا کچھ مشکل نہ ہوگا۔ لیکن وہ تو وہاں کمبخت چاردیواری کے اندر رہتی ہیں۔"

"میں تو کہتا ہوں، یار بڑے گدھے ہو۔ یعنی جناب نے اس کو موہ لیا تھا، اور پھر بھی چڑیا کو ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ ارے یار تم غالباً اپنے مذہبی خیالات وغیرہ کے چکر میں آکے چوک گئے۔"

"لیکن، تم جانتے ہو، سفر تھوڑا تھا، اور آدمی وغیرہ سب وہاں موجود تھے۔ لیکن جب وہ اتر گئی تو میری طرف دیکھ کر مسکرائی اور آنکھ ماری اور شرمائی شرمائی معلوم ہوتی تھی جیسے وہ مجھ سے ملاقات جاری رکھنا چاہتی ہے۔ اور جب ہم دونوں لاری میں سے اتر رہے تھے تو میں نے اس کے ہاتھ کو اس زور سے بھینچا کہ وہ بھی عمر بھر یاد رکھے گی کہ کسی نے اُس سے ہاتھ ملایا تھا۔ وہ یادگار کے لئے تھا۔"

مزدُور

(۱)

شام۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل۔ شام، سرخ اور عنابی۔ آسمان پر خون، اس جگہ جہاں زمین اور آسمان ملتے ہیں۔ اُفق پر خون جو بتدریج ہلکا ہوتا جاتا تھا، نارنجی اور گلابی، پھر سبز اور نیلگوں اور سیاہی مائل نیلا جو سر کے اوپر سیاہ ہو گیا تھا۔ سیاہی۔ سر پہ موت کی سیاہی۔ اور ایک آدمی زمین سے بیس فٹ اونچا کھمبے پر چڑھا ہوا، بندر کی طرح کھمبے پر چمٹا، ایک رسی کے ٹکڑے پر اپنے چوتڑ ٹکائے ایک لچھے میں سے تار لگا رہا ہے۔ یونیورسٹی کی سڑک پر بجلی کی روشنی کے لئے تار اور کھمبے۔ آسودہ حال طالبعلموں اور موٹروں پر چڑھنے والے رئیسوں کے لئے روشنی، کیونکہ مزدور کو بھی اپنی دوزخ بھرنی ہے۔ خوشحال اور کھاتے پیتے لوگوں کے لئے، جو قیمتی کپڑے پہنتے ہیں، جن کے دماغوں میں گوبر بھرا ہوتا ہے، روشنی کرنے کو کھمبوں پر چڑھ کے، ہوا میں لٹک کر اپنی جان خطرہ میں

ڈالنے کے بعد اس کو صرف چھ آنے روز ملتے۔ اور نوجوان کالے کوٹ اور سفید پاجامے پہنے ہوئے آسودگی کی شان اور پیسے کے گھمنڈ سے اُس بندر پہ جو اُن کی چربی سے ڈھکی ہوئی آنکھوں کے لئے روشنی لگانے کو چڑھا ہوا تھا ایک نظر ڈالتے ہوئے گذر جاتے۔

"ہمارے بورڈنگ ہاؤس کے پیچھے والی سڑک پر روشنی لگ رہی ہے۔ اب تو بجلی کی روشنی ہو گی۔ بجلی کی روشنی!" اور انکے کھوکھلے دماغ اسی کے راگ گاتے اور بجلی کے خواب دیکھتے۔ لیکن کوئی بھی اُس مزدور کا خیال نہ کرتا جو ننگے بدن ہوا میں لٹکا ہوا پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے کھمبے پر تار لگا رہا ہے۔ اور اُن کے پیروں کی احمقانہ آواز کھٹ . . . کھٹ . . . کھ . . . ٹ ہوتی اور وہ مستانہ روی سے چہل قدمی کرتے ہوئے گزر جاتے۔ اور مزدور کی رگیں اور پٹھے محنت کے اثر سے اس کے جسم پر چمکتے دکھائی دیتے اور رات بڑھتی آتی تھی۔

(۳)

مزدور ہوا میں ٹنگا ہوا تیزی سے کام کرتا رہا۔ اندھیرا ہو چلا تھا لیکن کام ختم کرنا لازمی تھا۔ گھر کا تصور اسکے دماغ میں بندھا تھا، سوکھی روٹی اور پیاز کی گٹھی کا، بیوی اور بچوں کا۔ گھر کا — اور

اس کی آنکھوں میں اپنی جھونپڑی کے سامنے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ بیٹھکر حقّہ پینے کا خیال پھر گیا، اور آرام اور نیند کا، اُس نیند کا، اس نیند کا جو دن بھر کام کرنے اور ٹھیکیدار کی گالیاں سننے کے بعد آتی تھی۔ اور ٹھیکیدار عیش و عشرت میں موجیں اُڑاتا تھا۔

وہ جلدی جلدی کام کرنے لگا۔ پیر کے انگوٹھے سے تار اوپر کھینچتا ایک ہاتھ سے اوپر اُٹھاتا اور دوسرے سے لپیٹتا۔

سامنے لان پر یونیورسٹی اسٹاف کلب کے ممبروں کے ہنسنے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ جو پنکھے کے نیچے بیٹھے تھے۔ جس کو ایک لڑکا کھینچ رہا تھا۔ کچھ ابھی تک گھٹتی ہوئی روشنی میں ٹینس کھیل رہے تھے۔ کچھ بیٹھے شربت پی رہے تھے، یا تصویردار میگزینوں کے ورق پلٹ رہے تھے، یا گپ لڑانے اور ٹھٹھے مارنے میں مشغول تھے۔

مزدور ایک سکنڈ کے لئے پسینہ پونچھنے کو رکا۔ اس کی نگاہ اسٹاف کلب کے ممبروں پر پڑی۔ "سسرے کیسے دھنّا سیٹھ بنے بیٹھے ہیں۔ ہمیں تو جل کی بوند نائیں ملتی اِن سارن کی موج ہے کیسے سربت پیت ہیں" اور اس نے منہ بنا کر زمین پر تھوکا۔

دوسری طرف سے جمعدار آنکلا جس نے ترقی کچھ تو اسلئے کی تھی کہ وہ ہوشیار تھا لیکن زیادہ تر اسلئے کہ وہ ٹھیکیدار کے گھر پہ خالی وقت میں

مفت کام کرتا تھا۔

"کیوں بے۔ ابھی تک ختم نہیں کیا۔ تیری کھاتر ہم کو رُکنا پڑ رہا ہے۔"

"اجی گھر تو ہمؤ کو جانو ہے۔"

"ختم کرتا ہے کہ نہیں۔ بک بک سے کام ہوئے ہے۔ تنکھاہیں سے کٹوا دونگا۔ سات بج چکے ہیں۔"

مزدور نے جلدی جلدی کام کرنا شروع کیا۔ لیکن تار کا لچھا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر سڑک پہ پھیل گیا۔ جمعدار نے ایک گالی دی اور سڑک کے بیچ میں کھڑا ہو کر تار پیٹنے لگا۔ اتنے میں پیں پیں پیں موٹر کا ہان سنائی دیا۔ موٹر کار رُک گئی۔

"حرامزادہ! کیا دکھائی نہیں دیتا؟" ایک صاحب جن کا سر چھوٹا سا تھا اور بڑی بڑی مونچھیں دونوں طرف لٹکی ہوئی تھیں، چلاّنے لگے: "راستہ سے ہٹ کر کام نہیں کر سکتا؟ گدھا کہیں کا —— جلدی سمیٹ۔ ہمیں دیر ہو رہی ہے۔"

جمعدار نے جلدی سے تار ایک طرف کھینچ لیا۔

"سرؤ تیری وجہ سے گاری پڑی۔ کیوں بے۔ اسی کام کی مجوری ملتی ہے؟ اگر تنکھاہیں سے نہ کٹوایا تو میرا نام رام لال نہیں۔"

اور غریب مزدور نے بنئے کا خیال کیا۔ جسے اس کو پچاس روپیہ دینے تھے بنئے نے بھی اُسے گالیاں دی تھیں، اور جیل بھجوانے کی دھمکی دیکر سود چوگنا کر دیا۔ بے ایمان کس طرح ناک میں دم کرتے ہیں۔ قطرہ قطرہ لہو چوس لیتے ہیں۔ لیکن حاجتمند بیچارا اگر اُن کے پاس نہ جائے تو کیا کرے۔ مزدور کی لڑکی بارہ برس کی ہو گئی تھی۔ لڑکوں کے ماں باپ بہت زیادہ روپیہ مانگتے تھے، اور اس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ برادری نے اس بات پہ اُس کا حقہ پانی بند کر دیا۔ برہمنوں کو روپئے چٹا کے برادری کو منانا لازمی تھا۔ اس کے لئے سو آدمیوں کو کھانا کھلانا تھا۔ اس کے علاوہ شادی کے دیوتا کو بھی بھینٹ چڑھانی تھی۔ دیوتاؤں کو بھی روپیہ کی ضرورت تھی۔ وہ بھی بنئے تھے۔ اور وہ سال بھر سے زیادہ خالی بیٹھا رہا۔ برہمن نے صرف مندر میں پھول بتاشہ چڑھانے کے دو روپیہ لئے۔ برادری کو کھانا دینا ضروری تھا۔ اور اس پر شادی۔ ہر چیز میں روپیہ کی ضرورت تھی۔ اور غریب کا پیٹ کاٹ کے بنئے موٹے ہوتے ہیں۔

(۴۲)

جمعدار نے تار کو ایک سُتلی سے باندھ کر کھمبے پر مزدور کو پھینکا۔ وہ اپنے پیروں کو کھمبے سے ٹکا کر اسے لپکنے کو جھکا، لیکن لچھا اس کے ہاتھ سے پھسل گیا۔ اس کا دل کام سے بیزار ہو چکا تھا، اور اس کا جسم ڈھیلا اور بیجان سا ہو گیا تھا۔ جمعدار نے لچھا دوبارہ پھینکا، لیکن پھر وہ رہ گیا۔ مزدور نے جھپٹ کر اسے لپکنے کی کوشش کی، لیکن رسّی ٹوٹ گئی اور وہ دُور سڑک پر چھاتی کے بل جا کے گرا۔ جمعدار کے منہ سے ایک چیخ نکلی . . . . .

یونیورسٹی اسٹاف کلب کے ممبر اس آواز پر اپنی کرسیوں سے مڑے۔

"بھئی کیا ہوا؟"

"ایک آدمی گر گیا"

"کہاں؟"

"وہ مزدور جو کھمبے پر کام کر رہا تھا۔"

"چلو دیکھیں۔ مر تو نہیں گیا؟"

وہ دیکھنے کیلئے اپنی کرسیوں سے کھڑے ہو گئے۔ ایک صاحب تھوڑی دور دیکھنے آئے، لیکن واپس لوٹ کر سوچ بچار میں مشغول ہو گئے۔

دوتین نے ٹینس لان کے اس پار جانے کی ہمت کی، لیکن وہ جھاڑیوں کے اس طرف ہی رہ گئے اور ترس اور افسوس کا اظہار کرنے لگے۔ لیکن خون میں لتھڑے ہوئے آدمی تک جانیکی کسی کو جرأت نہ ہوئی۔

"اُف۔ کتنا خون نکلا ہے۔ بڑا تندرست رہا ہوگا۔

"تہ۔ تہ۔ تہ۔"

اس عرصہ میں کچھ نوکر اور طالبعلم مزدور کے چاروں طرف جمع ہو گئے۔ لیکن کوئی بھی اُسکے نزدیک نہ آتا تھا، کوئی اس کو چھونے کی ہمت نہ کرتا تھا۔ اور آدمی ہلا تک نہیں، اُسکے منہ سے ایک آہ بھی نہ نکلی۔ اُسکا جسم خون میں لت پت تھا، اُسکی آنکھیں اوپر کھنچ گئی تھیں، اُسکے رگ پٹھوں کی طاقت سلب ہو چکی تھی۔ اب وہ گھر اور آرام اور نیند کی راہ دیکھ رہا تھا۔ کوئی چلّایا، "پلنگ لاؤ" لیکن کسی نے اُسکو چھوا نہیں۔ ہر شخص موت کے ڈر سے خوف زدہ تھا۔ کچھ تانگے میں آتے ہوئے لوگ بھیڑ دیکھ کر اُتر پڑے اور دھکّے دیتے ہوئے اندر پہنچے۔ لیکن وہ بھی دور ہی سے گھورتے رہے۔ وہ بھی خوف زدہ تھے ــــ موت سے ــــ گویا موت کا پُتلا زمین پر پڑا ہوا تھا اور دوسرے مزدور بھاگتے ہوئے آئے اُنہوں نے اس کو پلنگ پر ڈالا اور ہسپتال لے چلے۔

---

(۴)

ایک پروفیسر صاحب جو اوروں کی طرح دور ہی سے کھڑے دیکھ رہے تھے بولے،

"بھئی سول سرجن کو بلانا چاہیئے۔"

"میجر حسن کو فون کر دو۔"

اور وہ اور لوگوں سے رائے لینے کو واپس چلے گئے۔ لیکن سب اس واقعہ کو بھول چکے تھے اور گپ اور ایک دوسرے کی بُرائی میں مشغول تھے۔ پروفیسر صاحب میجر حسن کو فون کرنے چلے جس پر کچھ لوگوں نے اُن کو رقیق القلب اور بیوقوف کہنا شروع کیا۔

"بھئی تم بھی کیا آدمی ہو۔ ایک مزدور کیلئے اتنی پریشانی!" . . .

میجر حسن اپنے دفتر میں تھے نہ گھر پر۔ وہ کلب میں تشریف رکھتے تھے۔ وہ چند لڑکیوں میں اس قدر منہمک تھے کہ فون تک جانا ناگوار معلوم ہوتا تھا۔

"ہیلو . . . و . . . و" انہوں نے بن کر رئیسانہ لہجہ میں کہا۔

"ہلو۔ کیا میجر حسن بولتے ہیں؟ میں ہوں پروفیسر عابد۔ میجر صاحب براہِ کرم فوراً تشریف لے آیئے۔ ایک آدمی کھمبے پر سے گر گیا، اور خون میں نہایا ہوا ہے۔"

"بھئی کوئی بات نہیں، اس قسم کے سینکڑوں واقعات روز پیش آتے ہیں۔ وہ تو مر گیا ہوگا۔"

"نہیں، نہیں۔ چلئے تو آیئے۔ شاید آپ اس کی جان بچا سکیں۔ اُس کو یونیورسٹی کے ہسپتال بھیج رہے ہیں۔۔۔۔"

ڈیم!" میجر صاحب نے آہستہ سے کہا۔۔۔

جب وہ اپنی جگہ واپس آئے تو ایک نوجوان لڑکی نے پوچھا

"کیا بات تھی؟"

"کچھ نہیں۔ حسب معمول کوئی شخص کہیں سے گر پڑا۔"

"مرا تو نہیں؟"

"معلوم نہیں۔ لیکن اغلب یہی ہے۔ کچھ اور پیو گی؟"

"لیکن آپ اُسے دیکھنے جایئے۔"

"اچھی بات ہے۔ کوئی جلدی نہیں۔ ایسے واقعات تو روز پیش آتے ہیں۔"

اور میجر صاحب بڑی دیر کے بعد اپنی کار میں آرام سے لیٹے ہوئے تشریف لائے۔ کچھ لوگ جو مزدور کی قسمت کا فیصلہ سننے کے انتظار میں ابھی تک کھڑے تھے میجر صاحب کو دیکھ کر ایک طرف ہو گئے۔ میجر صاحب بہت اطمینان سے سیڑھیوں پر چڑھے

اور ایک کمپوئنڈر سے دریافت کیا آدمی کہاں ہے۔ کمپوئنڈر انہیں ایک کمرے کی طرف لے گیا۔ وہ اندر داخل ہوئے اور چارپائی پر ایک مزدور کو پڑا دیکھ کر حقارت سے اِدھر اُدھر دیکھا اور بولے :

"کیا یہی آدمی تھا جس کے لئے مجھ کو اتنی تکلیف دی ؟ تم خود نہیں دیکھ سکتے تھے ؟ کیوں جی ؟"

"جی حضور۔ لیکن ہم آپ کا انتظار کر رہے تھے۔ ابھی تک زندہ ہے"

چونکہ وہ اُب آ ہی گئے تھے اس لئے میجر صاحب نے اس کی نبض پر ہاتھ رکھا۔ "کیا اس کو زندہ کہتے ہیں ؟ اس میں دھرا کیا ہے ؟ مر گیا"

انہوں نے زور سے اس کا ہاتھ چارپائی پہ پٹخ دیا، اور باہر چلے گئے...... لوگوں کے منہ سے اطمینان اور یکسوئی کی آہ نکلی ...... اور چارپائی پر آدمی ہلکے سے ہلا، اسے ایک سسکی آئی، اور وہ مر گیا۔

میرے ایک دوست نے ایک مرتبہ مجھکو ایک ڈائری دی
یہ دوست عجیب و غریب آدمی تھے۔ ان کا شوق ایسے عجیب و
غریب آدمیوں کو تلاش کرنا تھا جو اپنی وضع قطع میں بالکل نرالے
ہوں۔ مثلاً آرٹسٹس، موسیقی داں، کسی خاص ہنر کے ماہر، نیم پاگل، عشاق
جو اپنی محبت میں ناکامیاب رہے ہوں، وغیرہ وغیرہ۔ میرے دوست
اپنے آپ کو "دادائیسٹ" کہتے تھے جس کا مطلب تو بہت کچھ ہے
اور جسمیں آرٹ، مذہب، لٹریچر اور تمام دنیا کا ایک خاص اور نرالا
نقطۂ نظر شامل ہے لیکن فی الحال یوں سمجھئے کہ ایک وہ شخص جسمیں
شئے لطیف کی کلیتاً کمی ہو وہ مذاق کرنے کی کوشش کرے۔ جب
انہوں نے مجھ کو یہ ڈائری دی جو ان کے شوق کے کسی انوکھے نمونے
کی پیداوار تھی تو میں نے اس کو ایک نرالی اور دلچسپ چیز سمجھکر پڑھنا
چاہا۔ ڈائری مجلد اور ضخیم تھی۔ لیکن جب میں نے اس کے اوراق کو ادھر

اُدھر پلٹا تو کورِی معلوم ہوئی میں نے سوچا کہ یہ بھی میرے دوست کے "دادا ازم" کا ایک پہلو ہے، اور انھوں نے مجھ سے مذاق کرنے کے لیئے سادی ڈائری میرے ہاتھ میں تھمادی مگر اتفاق سے جب میں نے اخیر کے صفحوں کو دوبارہ یا سہ بارہ پلٹا تو میری نظر چند اوراق پر پڑی جو لکھے ہوئے تھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ صرف اتنی ہی بات لکھنے کیلئے پوری ڈائری خریدی گئی تھی۔ ڈائری کُل یہ تھی :-

وہ آنکھیں بڑی بڑی، ایک کنول کے پھول کی طرح کھلی ہوئی تھیں۔ ان میں پیار اور محبت اور رحم بھرا ہوا تھا۔ جب وہ کسی کی طرف دیکھتی تھیں تو اپنی نظر کے ساتھ جان بھی اُسمیں ڈال دیتی تھیں۔ اُن میں ایک مست ناگ کی خوبصورتی تھی۔ اُنکی سیاہی میں رات کے خواب۔ انکی سفیدی میں شہد کی شیرینی۔ اُن کے ہلکے ہلکے شربتی ڈوروں میں شراب کا نشہ۔ جب وہ جھپک جاتی تھیں تو معلوم ہوتا تھا کہ دو خوبصورت پیالے جامِ جم سے زیادہ عزیز، رکھے ہوئے ہیں۔ دو کٹورے جن میں سارے عالم کا حسن کوٹ کوٹ کر بھر دیا گیا ہے۔ جب وہ اٹھتی تھیں تو معلوم ہوتا تھا کہ ایک ابھی تک ڈھکا ہوا شراب کا پیالہ کھول دیا گیا ہے۔ اور اس میں شراب چھلک رہی ہے، یا ایک نرگس کا پھول پانی میں کھلا ہوا تیر رہا ہے۔ اور اُنکی پلکیں ان پر اسطرح سایہ کئے رہتی تھیں جیسے وہ ان کو نظرِ بد سے بچانیکے خیال

سے ہر وقت ان کی حفاظت کر رہی ہوں۔ ان کی بھویں سُبک اور نازک اور تیز اُن کو ترچھی نگاہوں سے بچانیکے لئے ہر وقت اپنی تلواریں برہنہ کئے ہوئے معلوم ہوتی تھیں۔

جب میں نے شروع شروع میں انکو دیکھا تو وہ اکثر کسی معنی خیز کیفیت سے برابر کھُلتی اور بند ہوا کرتی تھیں، میری طرف غور سے دیکھکر جھپکا کرتی تھیں۔ بات کرنے میں وہ اکثر مجھے آنکھ مارتی تھیں، ان میں وہ جذبۂ خود نمائی تھا جو خود اپنے آپ کو فراموش کر دیتا ہے۔ وہ مجھے التفات اور پیار سے دیکھتی رہیں، اُس التفات سے جو ہر عورت کی آنکھیں ایک مرد کو اس کا دل موہ لینے کیلئے کام میں لاتی ہیں۔ وہ چالاکی اور بہانے جس کو صرف ایک عورت ہی بڑی صفائی اور ہوشیاری سے الفت کے دام پھیلانے میں استعمال کرتی ہے جس طرح مکڑی اپنا جال بنانے کیلئے ایک بے رنگ شے کو استعمال کرتی ہے، اور مرد، بھُنگوں کی طرح اس جال کو نہیں دیکھ سکتے، اور اندھے بن کر گرفتار ہو جاتے ہیں۔

ایک عرصہ تک وہ مجھ کو کبھی نرمی سے، کبھی محبت اور پیار سے دیکھا کیں جب کبھی میں نہ ہوتا تو ان میں ایک فکر، ایک ایسی پریشانی ہوا کرتی جو ایک ماں کو اپنے بچے کی علالت میں ہوتی ہے۔ وہ برابر ڈانواں ڈول رہتیں۔ اُنکے بڑے بڑے خوبصورت ڈھیلے سفید اور خشک معلوم ہوتے، جیسے ایک چٹان

دھوپ میں معلوم ہوتی ہے۔ لیکن مجھے دیکھتے ہی اُن میں یکایک نرمی سی آجاتی۔ ایک خوشی اور تازگی ایسی فرحت جو گرمی میں ایک شربت کا گلاس پینے سے آجاتی ہے۔ پھر ان میں وہی چونچالی دکھائی دیتی۔ وہی بشاشت اور نرمی۔

اُن کا جادو مجھ پر رفتہ رفتہ کام کرتا گیا۔ میں اُن کے جال میں بغیر جانے ہوئے، بغیر اس بات کے احساس کے کہ میں گرفتار ہو رہا ہوں، خود بخود پھنس گیا۔ بالکل اسی بیخبری سے جو ایک شکار کو آہستہ آہستہ جنگل کے بیچ میں لے جاتی ہے، جہاں سے نکلنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ شکار اسی خیال میں رہتا ہے کہ وہ ابھی کچھ دور نہیں آیا اور پھر اس کو ایک دم سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ ایک خوبصورت لیکن بھیانک اور دشوار گذار جنگل میں آ کے گھر گیا ہے۔ بہت عرصہ تک مجھے اس بات کا گمان بھی نہیں ہوا کہ میں کسی خطرے میں پھنس گیا ہوں۔ صرف جب میں رات کو پلنگ پر لیٹتا تو وہ آنکھیں میرے دماغ میں ہوتیں۔ اور جب میں صبح کو نیند سے بیدار ہوتا تو سب سے پہلا خیال جو مجھ کو آتا وہ ان آنکھوں کا ہوتا، اور بڑی دیر تک لیٹے لیٹے ہی میں ایک سنسنی خیز اور ہیجان پیدا کر دینے والے تخیل میں کھویا رہتا۔ لیکن اس میں کسی اندیشے کی آگاہی کے بجائے حسن کا ایک احساس تھا، خوابوں کی اس خوبصورتی کا جو خنک شاموں کو تنہائی میں، کوہ کے دامن میں یا شفق کی رنگینی میں

عالم سکوت اور مناظر قدرت کے گداز مگر تسکین بخش سکون میں انسان پر ایک نشہ کی طرح سرایت کر آتی ہے۔ مجھے اُن آنکھوں کے خیال اور تصور سے جو آرام اور لطف حاصل ہوتا تھا میں اس کو بالکل اپنے سے علیحدہ کرنے کیلئے تیار نہ تھا۔ وہ دزدیدہ نگاہیں میرے تخیل کا ایک جز، میرے انجان دل میں پنہاں ہو کر میری زندگی کا راز بن گئی تھیں۔

ایک روز جب میری آنکھ کھُلی تو سب سے پیشتر مجھ کو ان آنکھوں کا خیال آیا جیسے ان کو خواب میں دیکھتے دیکھتے میری آنکھ کھُل گئی ہو اور میں اسی خیال میں محو ہوں۔ مارچ کا خواب آلود زمانہ تھا۔ ہوا ٹھنڈی ٹھنڈی چل رہی تھی۔ میں ان ہی آنکھوں کے خیال کے نشہ میں مست پلنگ پر پڑا رہا۔ دفعتاً مجھے خیال آیا کہ میں نے کوئی بڑا عجیب خواب دیکھا ہے، اور میں اُس کو یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ ذرا ذرا کر کے مجھکو خواب یاد آنے لگا۔ جیسے آہستہ آہستہ صبح کی روشنی بڑھتی آتی ہے۔ جیسے ایک مدتوں کی بھولی ہوئی چیز کسی خوشبو یا منظر کی مناسبت سے دماغ میں پھر جاتی ہے۔ مجھے ایک خوبصورت اژدہا، اُسکی تیز اور چمکیلی آنکھیں اور میں خود دکھائی دینے لگا۔ میں نے دیکھا کہ میں اپنے کمرے میں لیٹا ہوا ہوں وقت اور روشنی بہت خوشنما اور عجیب ہے، جیسے خوابوں کی دنیا میں ہوا کرتی ہے کہ باہر سے ایک نہایت ہی خوبصورت اور چمکدار سانپ کمرے میں آیا۔

اس کی سنہری گول گول آنکھیں ایک دلکش روشنی سے اسطرح چمک رہی تھیں کہ میری آنکھیں اُن سے علیحدہ نہ ہوتی تھیں، گویا اُن میں جادو کا اثر تھا اور اس نے میری آنکھوں کو گرفتار کر لیا تھا۔ میرے نزدیک آتے آتے وہ بڑا ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی صورت ایک بڑے لیکن نہایت ہی حسین سبز رنگ کے اژدھے کی ہو گئی۔ پھر وہ میرے جسم سے لپٹنا شروع ہوا۔ یہاں تک کہ اس نے میرے ہر عضو کو اپنے نرم نرم جسم سے بہت مضبوطی سے جکڑ لیا۔ اُس نے میرے جسم پر اس طرح بل دیئے کہ اُس کی گردن میرے منہ کے سامنے آکے ٹھہر گئی۔ پھر اس نے میری طرف غور سے ٹکٹکی باندھ کے دیکھا۔ ان گول گول سنہری آنکھوں کے بیچ میں دو کالے کالے نقطے تھے۔ ایک آن کی آن میں وہ نقطے پھیل کر بڑے ہو گئے۔ وہ سنہری آنکھیں غائب ہو گئیں۔ اور ان کی جگہ دو اور آنکھیں تھیں، مست کر دینے والی دو آنکھیں، جن کو میں جانتا تھا۔ . . . . اور یکایک مجھ کو ایک عجیب احساس، ایک ایسا احساس ہوا جس کو چھپا لینے کیلئے میں نے اپنے دل میں بند کر لیا جس کے افشا ہو جانیکے ڈر سے میں نے اپنی آنکھیں موند لیں ــــ یہ کہ مجھ کو ان آنکھوں سے محبت تھی . . . . .

اس کے بعد سے وہ آنکھیں ہر وقت شب و روز میری آنکھوں

میں پھرا کرتی تھیں اور میں اُن آنکھوں کے خوابوں میں غرق دُنیا سے الگ رہتا اور اپنے آپ کو ایک ایسی رانی کا سرتاج تصور کرتا جس کی مثال دنیا میں نہیں تھی۔

جب میں نے کچھ عرصہ کی جدائی کے بعد پہلی بار اُن کو دوبارہ دیکھا تو مجھے ان آنکھوں میں ایک عجیب کیفیت کا احساس ہوا۔ یا تو انہوں نے میری آنکھوں میں میرے نئے راز کو پڑھ لیا تھا یا کوئی اور ہی بات تھی۔ لیکن مجھ کو دیکھ کر ان میں ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اس سنجیدگی اور متانت اور لاپروائی کی جگہ جو اُن میں مجھ کو دیکھنے سے پیشتر موجود تھی ایک ایسی بشاشت اور تازگی آگئی جو صبح کو ایک کلی کے کھل کر پھول ہو جانے پر آجاتی ہے۔ ان میں غرور اور خوشی حد درجہ بھری ہوئی تھی۔ لیکن ذرا ہی دیر کے بعد اُن کی فرحت دور ہو گئی۔ اور ایک افسوس اور رنج ان میں دکھائی دینے لگا۔ ایک ایسی صعوبت جو اپنے کسی عزیز دوست کے برباد ہو جانے پر ہوتی ہے . . .

مجھے دو اور آنکھیں یاد آتی ہیں۔ جن میں میں نے کچھ اس سے ملتی جلتی کیفیت دیکھی ہے . . . . وہ ایک بنگالن کی آنکھیں تھیں وہ اس قدر پر سکون اور تسکین بخش تھیں جیسے مئی جون کی دھوپ میں درختوں کی چھاؤں۔ اُن میں ایک شاہانہ بردباری تھی، وہ

عظمت اور حسن جو نور جہاں کو قدرت نے شاید ہی عطا کیا ہوا۔ وہ آنکھیں بڑی اور نشیلی تھیں، بیمار پپوٹے اسطرح گرے رہتے تھے جیسے کسی بوجھ سے جھک رہے ہوں، نشہ سے بند ہو رہے ہوں۔ گویا حسن کے بوجھ کو سنبھال نہ سکتے ہوں۔ ان میں ایک گہرائی تھی۔ ایک ایسی گہرائی جو میں نے ایک رقاصہ کی بیباک آنکھوں میں دیکھی ہے۔ پانی کی عمیق گہرائی، خوابوں کی بے پناہ دنیا، جن میں دیکھنے سے وہی احساس ہوتا جو ایک شخص کو دارو کے نشہ میں ہوتا ہے۔ جس کی گہرائی کا بھی، خوابوں کی تاریک لیکن حسین گہرائی کی طرح پتہ نہیں چل سکتا۔ اُن آنکھوں کو دیکھ یہی معلوم ہوتا تھا گویا دارو پی لی ہے۔ اور اس کے اثر سے آدمی ایک علحدہ دنیا میں، جو خوابوں کی طرح رنگین اور عمیق اور اندھیری ہے، غلطاں و پیچاں ہے۔ جیسے ایک دم سے دارو کے نشہ میں انسان باخبری کے عالم سے بیخبری کی دنیا میں پہنچ کر رنگین مناظر دیکھنے لگتا ہے، جس کی تہ کا کوئی پتہ نہیں ملتا۔ اُسی طرح ان آنکھوں کو دیکھ کر بھی انسان اُن کی دنیا میں کھو جاتا تھا، گویا آسمان سے بھی پرے دیکھنے لگتا تھا، جو نگاہ اور بقا کے بیچ میں پردہ حائل کئے ہوئے ہے . . . . جب میں نے اُن کو پہلی مرتبہ دیکھا تو اُنکا عاشق ان کے ساتھ تھا۔ وہ بار بار اپنی شاہانہ بُردباری سے اُس کی

طرف اُٹھتی تھیں، لیکن ان کی بُردباری میں علیحدگی نہ تھی بلکہ ایک انکساری، عشق کی خود فراموشی تھی۔ ان میں اپنے عاشق کی موجودگی اور اس کے التفات کے احساس کا غرور جھلک رہا تھا، اور ایک کامل خوشی ان میں عیاں تھی۔ وہ بار بار دزدیدہ طریقے سے اپنے عاشق کو دیکھتی تھیں، چوری سے برابر اُسکا پیچھا کئے رہتی تھیں۔ اُن سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنے عاشق کے قدموں میں بچھی جاتی ہیں ... لیکن جب میں نے ان کو دوبارہ دیکھا تو اُن کا عاشق اُن سے بچھڑ چکا تھا۔ اُن میں اب چمک بالکل نہ تھی۔ وہ ایک حد تک گڑھے میں دھنس کر چھوٹی چھوٹی رہ گئی تھیں۔ اُن کے پپوٹے اتنے زیادہ جھکے ہوئے تھے جیسے نیند میں بند ہو جاتے ہیں۔ اُن میں گہرائی نہ دکھائی دیتی تھی، بلکہ ایک پردہ سا پڑا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ان کی بُردباری غائب ہو گئی تھی، اور اس کی جگہ ایک بے رخی تھی، ایک ایسی لاپروائی جو صرف ایک بیوہ کے چہرہ پر ہوتی ہے۔ اُن میں صرف ایک شبہ کا اظہار ہوتا تھا، اس بات کا کہ دنیا ایک دھوکا ہے۔ اور عشق بے کار محض۔ اُن میں رنج تھا جس نے ان کو نڈھال کر دیا تھا، اور جو اُن پر اور ان کی بصارت دینوی پر پردہ ڈالے ہوئے معلوم ہوتا تھا۔ وہ ایک مقیّد جانور کی طرح اپنی

مجبوری سے مانوس تھیں۔ لیکن کسی ایک چیز پر جمتی نہ تھیں بلکہ ایک سوز اور پریشانی سے جھُکی جاتی تھیں۔ اور جب کبھی وہ ایک طرف ٹکٹکی باندھ کے دیکھنے لگتیں تو اُن میں ایک کھوئی ہوئی کیفیت ہوتی جیسے وہ اس دنیا کی کسی چیز کو نہیں دیکھ رہی تھیں، بلکہ غرقِ تماشا تھیں۔ ایسی حالت میں وہ پتھرائی ہوئی دکھائی دیتیں، اس طرح سے کھوئی ہوئی جیسے اس شخص کی آنکھیں جس کی یادداشت ختم ہو گئی ہو۔ جو بغیر جھپکے ہوئے اپنے سامنے گھورا کرتی ہیں۔

کچھ ایسی ہی کیفیت میں نے اس وقت اُن آنکھوں میں بھی دیکھی۔ مجھے آج تک اُن کا راز معلوم کرنے کی تمنّا ہے۔ یہ جاننے کی کہ کن خیالات کی وجہ سے اُن میں یہ مختلف کیفیتیں پیش آئیں . . . . . .

غالباً یہ میرا وہم و خیال ہی ہے، اور اُن میں کوئی خاص جذبات نہ تھے۔ لیکن میں اُس کیفیت کو جو میں نے اُن آنکھوں میں دیکھی تھی۔ کبھی بھول نہیں سکتا۔ اور مجھ کو ہمیشہ اُن کا راز معلوم نہ کرنے کا افسوس رہے گا . . . .

ڈائری اس جگہ ختم ہو گئی تھی۔

اس ڈائری کی تاریخ کے کوئی تین سال بعد بالکل اتفاقیہ میری ملاقات اُس کے مصنف سے ہوئی۔ میں اپنے "درد ادائیسٹ" دوست کے ہاں بیٹھا ہوا تھا۔ رات کا وقت تھا اور میرے دوست کے عجیب و غریب گول کمرے میں بالکل نرالی چیزیں دیکھنے میں آتی تھیں۔ اس کے سیاہ پردوں پر کچھ بھدّے اور بدنما سُرخ اور سبز اور سفید کپڑے کے کٹے ہوئے ہاتھی، گھوڑے، بیل، بکریاں، جوگی، آدمی، بچے وغیرہ سلے ہوئے تھے۔ ایک پردے پر کچھ مسجد سے ملتا جلتا ایک نقشہ بنا ہوا تھا اور ایک سُرخ رنگ کے جانور پر، جس کی پیٹھ پر دُم کی طرف ایک زرد رنگ کا چھتر بنا تھا، "علی صاحب" کا لکھا ہوا تھا۔ جس کے سمجھنے کے لئے بس یہی مثل عائد ہوتی تھی کہ سمجھنے والے کی موت ہے۔ کونوں میں جابجا مٹکے اور ٹھلیاں اسی قسم کی تصویروں سے رنگے ہوئے رکھے تھے۔ میزوں پر نرتو، تازئے، ہنومان، شیو وغیرہ کی مورتوں کے علاوہ لنگم اور مانم کے بُت بھی دکھائی دیتے تھے۔ اپنے کمرے کو میرے دوست ہندوستانی زندگی کی تضمین کہتے تھے۔ کچھ عجیب قسم کی چیز پینے کیلئے سامنے رکھی تھی، جس میں چاء، کافی، شراب، ستو، پانی وغیرہ وغیرہ ملے ہوئے

تھے۔ کئی ایک قسم کی روشنیاں ہو رہی تھیں۔ جو عجیب بیچ میلا سا رنگ پیدا کرتی تھیں۔ اسکے علاوہ عجیب عجیب قسم کے لوگ جمع تھے۔ کچھ بڑے بڑے بالوں والے ڈراؤنی شکل کے بنگالی، کالے بھجنگے مدراسی، کچھ قوی ہیکل مجنونانہ شکل کے ڈڑھیل، شمالی ہند کے باشندے یا کوئی گویا، کوئی سر پھرا، کوئی آہ بھرتا عاشق جس کی ڈاڑھی بنے مدتیں گذر گئی تھیں۔ گفتگو کچھ ہنسی کچھ رونے کے بیچ کی آواز میں زور زور سے ہو رہی تھیں۔

میں بیٹھا ہوا یہ سب قدرت کے کرشمے دیکھ رہا تھا کہ ایک نوکر جس کی ڈاڑھی بالکل بلبل کا گھونسلا معلوم ہوتی تھی جس کے بال کسی تھیٹر کے ایکٹر کے مصنوعی بالوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے، اور جس کے ہاتھ میں ایک بلّی کا ٹکڑا تھا کمرے میں آیا اور زور زور سے تین بار اپنے ڈنڈے کو کھٹکھٹا کر بولا "میر عاشق کی تشریف کا ٹوکرا" اور پھر باہر چلا گیا۔

اس کے بعد ہی ایک صاحب بڑے بڑے بالوں والے داخل ہوئے جن کی آنکھیں خون کی طرح سُرخ اور ایک پہاڑی غار کی طرح بڑی بڑی تھیں۔ میں نے اپنے دوست سے پوچھا یہ کون صاحب ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ یہ وہی شخص ہیں جن کی ڈائری میں نے تم کو

ایک مرتبہ دکھائی تھی بہت خوب، میں نے کہا، اور ذرا غور اور دلچسپی سے ان کو پھر دیکھا۔

میں اٹھ کر اُن کے برابر والی کرسی پر جا بیٹھا اور ہمت کر کے اُن سے پوچھا "حضرت معاف کیجیئے گا، لیکن کیا آپ مجھ کو بتا سکیں گے کہ اُن آنکھوں کا آخر کیا انجام ہوا ؟"

وہ میری طرف مڑے اور آنکھیں گڑو کر مجھے دیکھا، پھر بے رُخی سے بولے "خوب، آپ کا مطلب ؟"

میں نے کہا "گستاخی کی معافی چاہتا ہوں لیکن مجھ کو اُن آنکھوں سے دلچسپی ہو گئی ہے جن سے آپ کو محبت تھی"

یہ سن کر انھوں نے بے ساختہ اپنی کرسی سے اُچھل کر بڑے تعجب سے کہا "مجھ کو اور محبت !" اور پھر وہ اس طرح زور زور سے قہقہے مارنے لگے جیسے کسی نے یکایک اُن کے گُدگُدیاں کر دی ہوں۔ اور پھر وہ فوراً میری طرف سے اس طرح پیٹھ موڑ کر بیٹھ گئے۔ جیسے میں وہاں موجود ہی نہ تھا اور جیسے میں نے اُن سے کوئی بات پوچھی ہی نہ تھی۔

ادبی شہ پارے

کمپنی کی حکومت داستان ہے اس صد سالہ دورِ پُر آشوب کی جب ہندوستان کو سیاسی طور پر محکوم اور اقتصادی لحاظ سے غلام بنایا جا رہا تھا۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب کاغذ اعلیٰ۔ اشتراکی ادیب باری مجلد ڈیڑھ روپیہ

طلسم خیال اردو کے مشہور و مایہ ناز ترقی پسند مصنف جناب کرشن چندر ایم۔ اے کے معرکہ آرا افسانوں کا مجموعہ ہر افسانہ اپنے موضوع کے لحاظ سے بہترین افسانہ ہے۔ قیمت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عہ

تین پیسے کی چھوکری اور دیگر جو حضرات افسانہ نگاری کے شائق ہیں اور افسانوں میں حقیقی انسانی روح دیکھنا چاہتے ہیں انہیں جلد از جلد قاضی صاحب کے ان افسانوں کا آرڈر بھیجنا چاہیئے۔ قاضی عبد الغفار خاں (مصنف "لیلیٰ کے خطوط") قیمت ۸عہ

آہنگِ رزم ہندوستانی زبان میں جنگی ترانوں کا پہلا مجموعہ۔ شجاعت اور غیرت کے جذبات ابھارنے والی کتاب۔ دوسرا ایڈیشن۔ دو نئی نظمیں بھی شامل ہیں + لکھائی چھپائی دیدہ زیب کاغذ عمدہ:۔ وقار انبالوی مجلد ۸ر

لینن بیسویں صدی کی سب سے بڑی شخصیت کی سوانح حیات جن کے آہنی عزم نے انسانیت کے پاؤں میں پڑی ہوئی زنجیروں کو کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ ڈاکٹر۔ کے۔ ایم۔ اشرف قیمت علر

مکتبہ کی دیگر مطبوعات کے لئے "مکتبہ اردو" کی مکمل فہرست کتب طلب کریں

مکتبہ اردو، لاہور